
ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ
اقبا
شوال۔ ذی قعدہ۔ ذی الحجہ۔۲۰ھ
جنوری، فروری، مارچ ۲۰۰۰ء
شمارہ: ۳۴
صفا

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، دعوتی، ادبی سہ ماہی رسالہ

سہ ماہی صفا
حیدرآباد

شوال۔ ذی قعدہ۔ ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ

جنوری، فروری، مارچ ۲۰۰۰ء

شمارہ: ۳۴

زرِ سالانہ Rs. 120/- معاونینِ خصوصی Rs. 1000/-

فی شمارہ Rs. 35/-

شعبۂ نشر و اشاعت دار العلوم سبیل السلام مدینۃ العلم (Educational City)

(عقب صلالہ بارکس حیدرآباد ۵۰۰۰۰۵) Ph: 4440450 FAX: 040-4441835

انتخاب

"مسلمانوں کے تنزل کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انہوں نے خیر و بھلائی کے لئے محنت و مشقت کرنا چھوڑ دیا، اسلام جو خیر کا سرچشمہ ہے مسلمان چاہتا ہے کہ وہ بغیر قربانی دئے حاصل ہو جائے اور کسی قسم کی جدوجہد نہ کرنی پڑے، یہ کیسے ممکن ہے؟ اچھی چیز اگر حاصل کرنا ہے تو قربانیاں دینا ہوں گی، صحابہؓ نے اسلام کے لئے جان کی بازی لگادی تھی، اسلام کی راہ میں بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔

یاد رکھئے! اسلام امن و سلامتی کا پیغام بر ہے، اس کی راہ عشق و محبت کی راہ ہے اور عشق کی راہ میں رکنا اور ٹھٹھکنا سب سے بڑا جرم ہے، یہ تو ذوق و شوق ہی کے ذریعہ طے ہوتی ہے۔ تکلیف و مصیبت اس راہ کے لئے زاد ہے، جدوجہد اور شوقِ مسلسل اور سعیِ پیہم اس کا سرمایہ ہے، اس راہ کی مشکلات چلنے والے کے لئے باعثِ مسرت ہیں اور اس کی کٹھنائیاں مسافر کی زندگی کو تابناک بناتی ہیں۔

اس لئے میں آپ سے کہوں گا کہ تذبذب کو چھوڑیں، اعتماد بحال کریں، شک کی بجائے یقین پیدا کریں، اتنا یاد رکھیں کہ وہ مصیبتیں جو اس یقین کی وجہ سے آئیں گی، ان مصیبتوں سے یقیناً کم ہوں گی جو شک کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، یقین و اعتماد کے بعد آپ کا دل و دماغ مطمئن ہوگا، دشواری اگر ہوگی تو جسمانی، روح مطمئن رہے گی اور شک و تذبذب کی راہ میں ہو سکتا ہے کہ آپ کو مادی و جسمانی سہولتیں مل جائیں، مگر روح کا سکون، دل کا چین اور دماغ کا اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا، اس یقینِ کامل کو توحید خالص کہتے ہیں، اس یقین کے بعد آپ کو صرف ایک کے سامنے جواب دہی کا احساس ہوگا، ایک کے سامنے جھکیں گے، اور ایک ہی کی عبادت کریں گے۔

مسلمانو! اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرو اور اسلام کی راہ میں محنت و مشقت کرو، دل میں خدا کا خوف اور اسلام کی محبت پیدا کرو، یہی خیر ہے، اس کے لئے تمہیں جدوجہد کرنی ہے، اسی خیر کے لئے تم اپنی تمام صلاحیتیں خرچ کرو، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔"

امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

(جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

اس شمارے میں

دستک

"کسی قوم کے لئے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ صحیح شعور سے خالی ہو، ایک ایسی قوم جو ہر طرح کی صلاحیتیں رکھتی ہو اور دینی و دنیاوی دولتوں سے مالا مال ہو، لیکن اس کو نیک و بد کی تمیز نہ ہو، وہ اپنے دوست و دشمن کو نہ پہچانتی ہو، پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی اس میں صلاحیت نہ ہو، اپنے رہنماؤں اور قائدین کا احتساب کرنے کی اور قومی مجرموں کو سزا دینے کی اس میں جرأت نہ ہو، وہ خود غرض رہنماؤں کی چرب زبانی و شیریں کلامی سے مسحور ہو جاتی ہو اور ہر مرتبہ نیا دھوکہ کھانے کے لئے تیار رہتی ہو وہ قوم اپنی تمام دینی ترقیات اور دنیاوی سرفرازیوں کے ساتھ قابلِ اعتماد نہیں...... اصل قابلِ اعتبار چیز یہ ہے کہ قوم کا ضمیر اور شعور اتنا بیدار ہو جائے کہ وہ کسی غلط چیز اور مجرمانہ فعل کو کسی حالت میں اور کسی شخص کے لئے بھی برداشت نہ کر سکے۔

عالمِ اسلام (اور اہلِ اسلام) کی ایک بہت بڑی ضرورت اور اس کی ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ امت کے مختلف طبقات اور عوام میں صحیح شعور پیدا کیا جائے اور جمہور کی عقلی مدنی اور سیاسی تربیت کی جائے، یاد رہے کہ تعلیم کی اشاعت اور تعلیم یافتہ اشخاص کی کثرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قوم میں شعور بھی موجود ہے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کے عموم اور علوم کی اشاعت سے شعور کے بیدار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، لیکن شعور پیدا کرنے کے لئے بہر حال مستقل جد و جہد کی ضرورت ہے۔ مسلمان رہنماؤں اور مسلمانوں میں اصلاحی کام کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ جس قوم میں شعور کی کمی ہے، وہ قوم اعتماد کے لائق نہیں، خواہ اس کو اپنے قائدین پر کتنا ہی اعتماد ہو اور وہ ان کی پیروی اور اطاعت میں کیسی ہی چستی اور سرگرمی دکھائے اور ان کی دعوت پر کتنی ہی عظیم قربانیاں پیش کرے۔ اس لئے کہ جب تک اس کا شعور تیار نہیں اور وہ بالغ نظر اور پختہ خیال نہیں ہوئی ہر آن اس کا خطرہ ہے کہ وہ کسی دوسری دعوت اور تحریک کا آلۂ کار بن جائیگی اور آن کی آن میں سالہا سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا، جس قوم کا شعور بیدار نہیں ہوا، اور جس میں خود سوچنے اور اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پر میدان میں پڑا ہو اور مختلف سمت کی ہوائیں اس کو ادھر سے ادھر اڑاتی پھرتی ہوں۔

اس لئے عالمِ اسلام (اور اہلِ اسلام) کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں صحیح شعور

پیدا کیا جائے ، ایسا شعور جو نہ کسی ظلم و نا انصافی کو برداشت کر سکے ، نہ دین و اخلاق سے انحراف کو ، جو صحیح اور غلط ، خلوص اور نفاق ، دوست اور دشمن ، مصلح اور مفسد کے درمیان آسانی سے تمیز کر سکے ، مجرم اس کی ناراضگی سے بچ نہ سکیں اور مخلص اس کے اعتراف اور قدر شناسی سے محروم نہ رہیں ، وہ اپنے تمدنی ، سیاسی ، اجتماعی اور دینی مسائل و معاملات میں ایک عاقل و بالغ انسان کی طرح غور کر سکنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو ،

جب تک یہ شعور نہ پیدا ہو کسی اسلامی
ملک و قوم کا جوشِ عمل ، صلاحیتِ کار
دینی جذبات اور مذہبی
زندگی کے مظاہر و مناظر کچھ زیادہ وقعت
نہیں رکھتے "

مُفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء ، لکھنؤ)

آئینہ

"حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرماتے تھے کہ آج کل لوگ اتفاق اتفاق تو پکارتے ہیں، مگر اس کی جڑ کی ان کو خبر نہیں، اتفاق کی جڑ تواضع ہے، بدوں اس کے اتفاق نہیں ہو سکتا اور آج کل اتفاق کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص دوسرے کو اپنے سے متفق اور اپنی رائے کا تابع بنانا چاہتا ہے، اگر وہ دوسرا بھی ایسا ہی چاہے گا تو اتفاق کیسے ہوگا؟ پس کبر کے ہوئے ہوئے اتفاق ممکن نہیں اتفاق محض تواضع سے ہوگا، ہر شخص دوسرے کی موافقت اور تقلید کے لئے تیار ہو (اور بعض معاملات میں اختلاف کو برداشت کرتے ہوئے "مشترکہ امور" میں اتحاد کی صورت پیدا کی جائے) ورنہ اتفاق دشوار ہے اور اگر ہوا بھی تو محض زبانی اور کاغذی ہوگا۔

اس کی نظیر امام ابو حنیفہؒ کی ایک وصیت ہے، جو اپنے صاحبزادہ حمادؒ کو کی تھی کہ تم مناظرہ نہ کرنا صاحبزادہ نے عرض کیا کہ حضرت! میں نے تو آپ کو مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، پھر مجھے کیوں منع فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ ہمارے مناظرہ اور تمہارے مناظرہ میں فرق ہے۔ ہم تو مناظرہ کے وقت یہ خواہش کرتے تھے کہ ہمارے مخالف کی زبان سے حق ظاہر ہو جائے اور ہم اس کا اتباع کر لیں، اس کی بات کو مان لیں، تا کہ ہمارے بھائی کو غلبہ و عزت حاصل ہو جائے اور تم یہ تمنا کرتے ہو کہ مخالف کی زبان سے حق ظاہر نہ ہو، بلکہ باطل ہی ظاہر ہو، تا کہ ہم اس کو مغلوب کر دیں اور خود غالب ہو جائیں پس ہم تو ہدایتِ مخالف کے طالب تھے اور تم ضلالتِ مخالف کے طالب ہو۔

دیکھئے! حضرت امام صاحبؒ اور حمادؒ کے زمانہ میں اتنا فرق ہو گیا، کتنی جلدی زمانہ بدل گیا اور اب تو یہ قصد ہوتا ہے کہ مخالف کی زبان سے جو بات بھی نکلے گی اس کا رد ہی کریں گے، خواہ حق ہی کیوں نہ نکلے۔

مخالفت کا اصل راز یہ ہے کہ نام مقصود ہوتا ہے، کام نہیں، اس میں طرفین میں کشاکشی ہوتی ہے، پھر جھگڑے فتنے فساد ہوتے ہیں۔"

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

زندگی کی شاخ سے چھوٹے بڑے کھلے، مرجھا گئے

محمد رضوان القاسمی

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی جو پہلودار شخصیت رہی ہے، اس کے پیشِ نظر عالمِ اسلام ہی کا نہیں، دنیائے انسانیت کا بھی آپ کے انتقال سے عظیم نقصان ہوا ہے، بنظر غائر دیکھا جائے تو آپ کے انتقال سے صرف ایک داعی، صاحبِ قلم، مصنف، مؤرخ، تذکرہ نگار، ادیب، مدبر، صاحبِ بصیرت، نباضِ وقت، زمانہ شناس قائد، علم ظاہری وباطنی کے غواص اور شناور، صاحبِ اخلاق، باکردار اور ملنسار عالم دین کا خلا نہیں ہوا ہے بلکہ ایک دور اور ایک عہد کا خاتمہ ہوا ہے۔ مولانا اپنے سنہ پیدائش اور سنہ وفات کے لحاظ سے کم وبیش بیسویں صدی کے پورے عرصہ پر محیط رہے، اس صدی کے عروج وزوال کو خود انھوں نے دیکھا، کتنی ہی علمی، تعلیمی، ملّی، فلاحی، دعوتی اور سیاسی تحریکیں، انجمنیں اور جماعتیں ان کی نگاہوں کے سامنے بنیں، پنپیں اور بعض ان میں سے مٹیں، اس لحاظ سے مولانا نہ صرف تاریخ داں تھے بلکہ خود تاریخ کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ ان کی فکر میں نہایت گہرائی اور گیرائی تھی، ان کے حالات زندگی سے ظاہر ہے کہ ان کی فکر رسا نے قرآن وحدیث، سیرتِ نبویؐ اور صحابہؓ، اسلاف، اکابر، مشائخ، اور بعض ممتاز معاصر علماء اور دانشوروں کی زندگیوں سے فیض حاصل کیا تھا۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

اور یہ بھی کہ۔

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

مجھے نہیں معلوم کہ مولانا کو "مفکر اسلام" کا خطاب سب سے پہلے کس نے دیا اور کب دیا؟ مگر یہ حقیقت ہے کہ "اسلام" کی حفاظت واشاعت کے سلسلہ میں آپ کی جو فکر مندی اور دردمندی رہی ہے، وہ بجا طور پر اس خطاب کا مستحق قرار دیتی ہے، ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے آپ کے جو رشحات قلم ہیں، ان

میں مفکر اسلام کی جو فکری بصیرت اور خیالات کی پاکیزگی اور پختگی ہے، عصر حاضر میں ان کا از سر نو مطالعہ "ملت بیضا" کے لئے از بس ضروری ہے، اس سے راستہ کی نشاندہی بھی ہوگی اور منزل کا سراغ بھی ملے گا۔

مولانا کی زندگی کا نہایت امتیاز وصف "اعتدال" ہے، ان کا "قلم" اور "قدم" دونوں ہمیشہ دائرہ اعتدال میں رہے، ان کی زندگی کی دوسری چیز جو حد درجہ ایک انسان کو متاثر کرتی ہے، وہ ہے ان کا "استغناء"۔ ان کی استغنائی زندگی بلاشبہ ایک "کرامت" کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا اپنے آبائی وطن رائے بریلی کے جس ظاہری کشش سے خالی "بیٹھکہ" میں قیام پذیر ہوتے تھے، وہ نصف دنیا کی سیر کرنے والے، مالدار او تمندوں کا وسیع حلقہ رکھنے والے اور مختلف ایوارڈ کے ذریعہ خطیر رقم پانے والے "مرد درویش" کی استغنائی زندگی اور درویشانہ مزاج کا مکمل نمونہ پیش کرتا رہا ہے۔ شاید اقبال کے شاہین نے ایسے ہی استغناء مزاج درویشوں کو دیکھ کر یہ کہنا سیکھا ہو ؎

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

یہاں یہ واضح رہے کہ بزرگوں کی زندگی میں "کرامت" کا ظہور ہوتا رہا ہے، جس اچھی صفت کا غلبہ ان کی زندگی میں رہا، یہ ان کے حق میں کرامت بن گئی، جسے کسی ایک شکل میں محدود نہیں کیا جاسکتا، کہیں "اتباعِ سنت" کا غلبہ رہا ہے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا پر نگاہ جمی رہی، اور اس ادا کے سانچہ میں ان کی زندگی ڈھلتی رہی، کہیں معاملات کی صفائی ستھرائی کا غلبہ رہا ہے، اسی طرح کی اور اچھی صفات ہیں، جن کی حیثیت انکی زندگی میں "کرامتی" رہی ہے۔ راقم الحروف کی نظر میں مولانا علی میاں کی بزرگانہ زندگی کیلئے "کرامت" کا جو درجہ رکھتی ہے، وہ ہے ان کا "استغناء" اور صرف رب بے نیاز کے سامنے انکی "نیاز مندی"۔

مولانا کے مزاج میں جو "درویشی" اور "استغنائی کیفیت" رہی ہے اسکی بہترین ترجمانی ڈاکٹر محمد اقبال کے ان دو شعر سے ہوتی ہے ؎

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی
کہاں سے تونے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

مولانا علی میاں کو ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا تھا، وہ چلے گئے، البتہ ان کی تحریروں، کتابوں اور افکار وخیالات سے استفادہ کی راہیں کھلی ہوئی ہیں ان راہوں پر چلنا ہی دراصل ان سے سچی محبت اور عقیدت کا

تقاضہ ہے۔ امید ہے کہ ہم سب ان تقاضوں کے تکمیل کرتے رہیں گے۔ دعا ہے کہ۔

مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین علیہ الرحمہ، ہندوستان کے ممتاز علماء وارباب فقہ وافتاء میں سے تھے، دارالعلوم دیوبند میں حصول تعلیم کے بعد ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم کے مسند افتاء پر فائز ہوئے۔ اور تا وفات فقہ وافتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، فتوی نویسی میں انہیں بڑا کمال حاصل تھا۔ فقہ اسلامی کی جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مفتی اعظم مولانا محمد شفیعؒ نے جدید مسائل کے حل کے سلسلہ میں جو روشنی دکھائی تھی، وہ اس روشنی کو آگے بڑھاتے اور پھیلاتے رہے، وہ اپنی فقہی بصیرت اور علمی ذکاوت کے لئے علمی وتحقیقی حلقوں میں معروف تھے۔

دورِ حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل پر ان کے بعض فتاوی، ان کی اصابت فکر، وسعتِ مطالعہ، بالغ نظری، ژرف نگاہی اور جہاں بینی کے آئینہ دار ہیں، وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی استنباطی اور استدلالی تحریروں سے ان کی علمی وتحقیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے، خصوصیت کے ساتھ جدید مسائل پر مشتمل ان کا مجموعہ فتاویٰ "منتخباتِ نظام الفتاویٰ" فقہ وفتاوی کی کتابوں میں ایک اہم ترین اضافہ ہے، اسی طرح انکے بعض اور غیر مطبوعہ فتاوی جو علمی اعتبار سے نہایت اہم اور علمی کام کرنے والوں کیلئے "چراغِ راہ" کی حیثیت رکھتے ہیں، کی طباعت واشاعت عمل میں لائی جائے تو ان کی افادیت کا دائرہ بڑھ سکتا ہے، ان کے ارادت مندوں اور خود دارالعلوم کو اس طرف توجہ دینی چاہئے۔

حضرت مفتی صاحب اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے نہایت معتدل اور متوازن تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ خلوص وللّٰہیت اور ورع وتقوی کا پیکر تھے۔ جب کبھی ان سے ملاقات ہوئی، پرانے بزرگوں کی یاد تازہ ہوتی رہی، حقیقت یہ ہے کہ قحط الرجال کے اس دور میں ایسے بافیض اصحاب علم وتحقیق کی رحلت، ہندوستان کی امت اسلامیہ کے لئے ایک عظیم حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اور ملت کی دینی وعلمی رہنمائی کے میدان میں جو خلاء پیدا ہوا ہے، اسے پر فرمائے۔

مولانا محمد حنیف ملّی، کا شمار ہندوستان کے معروف علماء میں ہوتا تھا۔ وہ مولانا عبدالحمید نعمانی بانی معہد

ملت مالیگاؤں کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے معزز رکن تھے۔ اور ملک کی مختلف دینی، علمی اور اصلاحی تحریکوں اور اداروں سے بھی ذمہ دارانہ تعلق تھا۔ وسعتِ مطالعہ اور پختگی علم کے ساتھ عربی وار دو کے ادیب تھے۔ ان کی متعدد علمی تصنیفات اپنے مواد اور زبان و بیان کی سلاست اور روانی کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کی حامل ہیں۔ اور اسی لئے حکومتِ مہاراشٹرا نے انہیں متعدد گرانقدر انعامات دیئے، ان کا ادبی ذوق نہایت نکھرا اور صاف ستھرا تھا، جس موضوع پر لکھتے محنت سے لکھتے، اسی لئے ان کی تحریریں قدر کی نگاہوں سے پڑھی جاتی رہی ہیں، علمی و تحقیقی ذوق بھی بلند تھا۔ معہد ملت مالیگاؤں جیسی بافیض دینی دانش گاہ میں بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔ اپنے اس باعظمت درس کی وجہ سے وہ "شیخ الحدیث معہد ملت" کی حیثیت سے پہچانے جاتے رہے۔

حیدرآباد سے وہ خاص تعلق رکھتے اور یہاں پر منعقد ہونے والے علمی، دعوتی اور ادبی سمیناروں میں شرکت کرتے رہے، دار العلوم سبیل السلام سے انہیں خصوصی لگاؤ تھا۔ بخاری شریف کے افتتاحی واختتامی درس کیلئے وہ کئی دفعہ یہاں تشریف لے آئے۔ اور اپنے عالمانہ وفاضلانہ اور محدثانہ خطاب سے محظوظ فرمایا۔ گذشتہ شعبان (۱۴۲۰ھ) میں مالیگاؤں کے ایک سفر میں مولانا مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل رہا، ادھر ایک عرصہ سے وہ علیل تھے۔ اور ملاقات کے وقت بھی نقاہت اور کمزوری محسوس ہورہی تھی۔ اس کے باوجود جس خوش اخلاقی، محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آئے اس سے طبیعت بے حد متاثر ہوئی اس کے نقوش ابھی بھی ذہن ودماغ میں تازہ ہیں، مگر ان کا وقتِ موعود آگیا۔ اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد، مولانا مرحوم کے ارکانِ خاندان اور معہد ملت کے اساتذہ وطلبہ سے اظہار تعزیت کرتا ہے، اور دعاء کرتا ہے کہ اللہ تعالی مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انکے درجات کو بلند کرے۔

گذشتہ ماہ فروری اور مارچ (۲۰۰۰ء) میں حیدرآباد کی بھی تین اہم شخصیتوں کا انتقال ہوگیا، ان میں سے ایک حضرت سید شاہ علیم الدین شرفیؒ سجادہ نشین درگاہ شریف شرفی چمن سبزی منڈی ہیں، یہ اپنے علم وفضل تقویٰ وپرہیزگاری اور خدمت خلق کے اعتبار سے نہایت ممتاز تھے، رشد وہدایت کے کام میں لگے رہے، وعظ ونصیحت کے ذریعہ پیغامِ حق پہنچاتے رہے، صوفیانہ اور متوکلانہ زندگی متاثر کن تھی، شعر وادب سے بھی لگاؤ اور تعلق تھا، نعتیہ شاعری سے ان کا حبِ نبویؐ جھلکا نہیں بلکہ چھلکا پڑتا تھا متوسلین اور معتقدین کا ایک بڑا حلقہ رکھتے تھے، گاہ بگاہ مجالس اور تقریبات میں ان سے ملاقات ہوجایا کرتی تھی، نہایت خلوص اور محبت

سے پیش آتے تھے۔ایک زمانہ میں محبّ مکرم جناب قاری محمد ظہیر الدین شرفی مرحوم کے ساتھ اکثر ملنے کا موقع ملتا تھا،اور ملنے کے بعد سرور وانبساط کی کیفیت سے ہمکنار ہوتا تھا۔ شرفی صاحب بلاشبہ اگلی شرافت کے نمونہ تھے۔ جمعہ کے دن ان کا انتقال ہوگیا مغفرت ونجات کا پروانہ ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حمید الدین شرفی (ڈائرکٹر آئی ہرک)اوران کے دیگر برادران اور ارکانِ خاندان سے ادارہ ''صفا'' اظہار تعزیت کرتا ہے۔

ایک دوسری اہم شخصیت جناب شاہد عظیم مرحوم کی ہے، یہ عظیم صحافی اور نامور ادیب تھے۔ بچوں کے ادب پر انھوں نے جوادبی سرمایہ چھوڑا ہے، وہ بڑا قیمتی ہے، ماہر طیور کی بھی حیثیت سے انکی بڑی شہرت تھی۔ شاہد صاحب ایک عرصہ سے روزنامہ سیاست حیدر آباد سے وابستہ رہے، اور یہاں انھوں نے اپنے کام سے نام پیدا کیا۔ ان کے ملنے کا انداز متواضعانہ اور مخلصانہ ہوتا تھا اور یہ عظیم مرحوم کی عظمت کی دلیل تھی۔ طویل علالت کے بعد موت، زندگی پر غالب آکر رہی، اور یہ ہر انسان کا مقدر ہے۔ خدا مغفرت کرے۔

تیسری شخصیت روحی قادری مرحوم کی ہے۔ شعری دنیا میں ان کا بڑا اونچا مقام تھا، اساتذہ سخن کی صف میں شمار ہوتا تھا۔ نامور ادیب اور شعراء ان کی فکر کی پختگی اور کلام کی برجستگی کے معترف رہے۔ وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے شاہین صفت درویش تھے۔ کسی کی زندگی میں ایسی درویشی آتی ہے تو قدر دانی بھی ایسے شخص کی پیشانی کا بوسہ لیتی ہے، اور روحی قادری ایسے ہی خوش قسمت انسان تھے۔ انھوں نے شاعری میں ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے[1]، مگر روحی کی شاعری کی روح تصوف ومعرفت رہی ہے اور جب یہ روح کسی کی شاعری میں آجاتی ہے تو مرنے کے بعد بھی وہ زندہ رہتا ہے۔ دیکھئے روحی نے اس حقیقت کو روحانیت سے لبریز اس کرامتی شعر میں کس طرح ادا کیا ہے۔

ہم نہ ہوں تو کیا ہماری شاعری رہ جائے گی
شمع بجھ جائے گی لیکن روشنی رہ جائے گی

اللہ تعالی روحی کی روح کو اعلی علیین میں جگہ دے، اور آخرت میں عفو وکرم اور مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

یہ تمام مرحومین اپنے نام اور کام کے اعتبار سے اپنا مقام رکھتے تھے، اپنی اپنی عمر پوری کر کے خدا کے حضور حاضر ہوگئے، ڈاکٹر محمد اقبال کی مشہور نظم ''گورستانِ شاہی'' میں دو شعر نہایت معنی خیز اور سبق آموز ہیں، اور فلسفۂ موت وحیات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

زندگی انساں کی ہے مانند مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم ، چہچہایا ، اڑگیا

---

(۱) رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں ۳ر نومبر ۱۹۹۶ء کو جو تعمیری و مقصدی مشاعرہ ہوا تھا اس میں روحی قادری مرحوم نے بھی شرکت کی تھی۔

آہ ! کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم ، کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے ، کھلے ، مرجھا گئے

دنیا کے مذاہب میں موت وحیات کے بارے میں جو تصورات پائے جاتے ہیں ان کے مقابلہ میں اسلام کا تصورِ موت وحیات سب سے حقیقت پسندانہ اور تسکین بخش ہے، دلاسہ اور تسلی وتشفی کا پورا سامان موجود ہے۔اقبال کے درج ذیل اشعار میں اسلام کے تصورِ موت وحیات کو اس طرح اجاگر کیا ہے ؎

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا ایک پیغام ہے
جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے ، فنا ہوتا نہیں
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

☆☆☆
☆☆
☆

قرآن حکیم کے معجزات

مولانا فضل الرحمٰن صاحب قاسمی
استاذ حدیث دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

سچے اور جھوٹے مذہب میں امتیاز کی بنیاد و چند خوارق عادات امور پر قائم کی جاتی ہے جنہیں دوسرے لفظوں میں معجزہ کہا جاتا ہے معجزہ ایسی چیز کو کہتے ہیں جو عام انسانی طاقت سے باہر ہو۔مذہب میں معجزہ کی بنیاد ڈال کر اللہ تعالیٰ اس کی حقانیت پر دلیل فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

سنریهم ایاتنا فی الافاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق o
ہم انکو عنقریب اطراف عالم اور انکے درمیان اپنی نشانیاں دکھائینگے یہاں تک کہ ان پر قرآن کی حقانیت ثابت ہوجائے۔

پہلا معجزہ : کتاب اللہ نے سب سے پہلے تمام اشیاء کی تمثیلات سے قطع نظر اور اپنے اس دعوی کے دیگر دلائل سے پیشتر کہ وہ اعجاز کا مخزن ہے۔اس نے اپنے آپ کو معجزہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورة من مثله o
کہ اگر تم ہمارے بندے پر اتاری ہوئی کتاب کے متعلق مذبذب ہو تو اس جیسی ایک سورۃ بھی بنالاؤ۔

امام رازیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں قرآن معجزہ ہے اس دعوے کو ہم دو مختلف صورتوں کے ساتھ مدلل کرسکتے ہیں۔

(۱) قطع نظر تمام باتوں کے میں صرف اس قدر پوچھتا ہوں کہ تم ایک ہاتھ میں قرآن کو لو اور دنیا کے مشاہیر فصحاء کے منتخب کلام لے لو۔اس کے بعد آپس میں موازنہ کر کے دیکھو۔

کہ دونوں میں کیا نسبت ہے اپنے طور پر کل تین احتمالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) یا تو قرآن ان کلاموں سے گرا ہوا ہوگا۔

(۲) یا ساوی ہوگا۔

(۳) یا بڑھا ہوا ہوگا۔

ان دعوؤں میں اگر اخیر کی شے متعین ہوجائے تو قرآن کا یہ دعویٰ کہ وہ معجزہ ہے ثابت ہوجائے گا۔

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ نے اس سوال و جواب کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ ہم سوال کرتے ہیں کہ قرآن کی حفاظت انسانی طاقتوں سے بالاتر ہے یا نہیں اگر ہے تو دعویٰ ثابت ہے اور اگر نہیں ہے تو اس وقت تک باوجود اس بات کے کہ اسلام کے مقابلہ میں دشمنوں کو جو کچھ کرنا تھا کر چکے اور کرتے رہتے ہیں سالہا سال تک مختلف ممالک میں اسی کا مادہ تیار کیا جاتا ہے کہ اسلامی خطرہ کو دنیا سے ہمیشہ کے لئے مٹا دینا چاہئے آلات حرب و جنگ ہر قسم کی سازشوں اور مکاریوں کی تیاری میں مصروف ہے اس کے سامنے فصاحت و بلاغت کے جتنے اصول و قوانین ہیں جو علم و فن کی صورت میں مدوّن ہو کر موجود ہیں۔ تمام عالم کے مشہور رہنماؤں کے کلام کا نمونہ بھی ان کے پیش نظر ہے ارباب دولت و ثروت بھی ہیں اگر ایک سے نہیں تو وہ استطاعت رکھتے ہیں کہ بڑے سے بڑے علماء اور بلغاء کی انجمن قایم کر کے قرآن کے مانند کوئی کتاب لکھوائیں لیکن یہ معجزہ نہیں ہے کہ سب کچھ ہو رہا ہے اور اگر نہیں ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس قدر کہ قرآن کے مثل ایک سورۃ بھی ہمارے سامنے نہیں لاتے۔

بعض لوگوں کو اس جگہ پر ایک شبہ ہوا ہے کہ قرآن کا اپنی حقانیت اس کے مثل نہ لانے سے ثابت کرنا اور اپنے کلام خدا ہونے کی یہ دلیل پیش کرنا کوئی معقول دلیل نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں تو پھر فیضی کی تفسیر غیر منقوط اور سعدی کی گلستاں بوستاں کو بھی معجزہ ہونے کا دعویٰ کرنا چاہیئے تھا کہ آج تک اس کا بھی کوئی مقابل نہ ٹھہر سکا۔ لیکن جس طرح قرآن نے چیلنج کیا ہے انہوں نے بھی تحدی کی تھی ورنہ دنیا دیکھتی کہ ایک ایران میں گلستاں بوستاں اور فیضی کی غیر منقوط تفسیر جیسی کتنی ہی کتابوں کا ڈھیر لگ جاتا اور یہ تمیز کرنا بھی دشوار ہو جاتا کہ آیا ان میں کون بہتر ہے اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد باری ہے کہ:

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القران لایاتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا ٥	آپ یہ فرما دیجئے کہ اگر سارے جن و انسان اکٹھے ہو کر اس بات کی کوشش کریں کہ اس قرآن جیسا کوئی اور قرآن بنالیں تو وہ کامیاب نہیں ہو سکیں گے اگرچہ اس کام میں ایک دوسرے سے مدد طلب کریں۔

دوسرا معجزہ: کیا لطف ہے جو غیر پردہ کھولے ۔۔۔ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے

قرآن مجید نے جس محکم نظام کو پیش کیا ہے اس سے بڑھ کر کسی آسمانی کتاب نے پیش نہیں کیا سب سے اول جو

چیز اس کی مقبولیت اور اس کے اعجاز پر رہنمائی کرتی ہے وہ خود مخالفین کا اس کے اسلوب بیان سے متاثر ہونا ہے اور اس کے اعجاز نمائی کا اقرار ہے۔

ہر برٹ کہتا ہے کہ اسلام کی شریعت حقہ قابل تعریف ہے اور اخلاقی تعلیم کا حامل ہے اور اس کی تعلیمات قابل عمل ہیں اسلامی شریعت دل پر بہ نسبت انجیل کے زیادہ نقش کرتی ہے۔(حوالہ) رین اسٹینلی ایسٹرن چرچ ۲۷۹

اب آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ کیا مذہبی نظام یا دنیا میں کوئی نظام کسی نے بھی اسلام سے بڑھ کر پیش کیا ہے، جس کی تصدیق خود اس کے مخالفین نے اس طور پہ کی ہو......؟

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۶ صف ۵۹۹ کا مقالہ نگار قرآن شریف کے بارے میں اپنا خیال ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ کلام ربانی کے مطالعہ سے خدا کی بزرگی و پاکی کا نقشہ ذہن نشین ہوتا ہے جس سے فطرت تاریخ اور نبیوں کی وحی بھری پڑی ہیں اور خاص کر اس کا مظہر اتم محمد ﷺ کے طفیل سے نظر آتا ہے۔

اسی کتاب میں ایک جگہ پر لکھتا ہے کہ قرآن کے احکام اس قدر عقل و حکمت کے مطابق واقع ہوئے ہیں کہ اگر انسان انہیں چشم بصیرت سے دیکھے تو وہ ایک پاکیزہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ شریعت اسلام نہایت اعلیٰ درجہ کے عقلی احکام کا مجموعہ ہے۔

اہل ہند میں گرو بابا نانک جنم ساکھی بھائی بالا صف ۱۴۷ سطر ۴ پر ایک شعر میں قرآن شریف کی عظمت و منزلت کا اقرار کرتے ہیں۔

توریت و زبور انجیل تری سن ڈھٹے دید رہ قرآن کل جگت میں پروار

یعنی توریت زبور انجیل کو ہم نے بغور دیکھا اور ویدوں کو بھی مگر دنیا کیلئے جو کتاب ہدایت کی موجب ہو سکتی ہے وہ قرآن شریف ہے۔

یوں تو معشوق گل و شمع بھی کہلاتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ مرتا ہے زمانہ کس پر

تیسرا معجزہ: قرآن شریف کا تیسرا اہم معجزہ اس کے بے پایاں علوم و معارف ہیں جو اس کتاب میں پائے جاتے ہیں اس میں انسانوں کے محدود نظریات شامل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اس سے بدرجہا بلند اور ماوراء ہے۔ انسانوں کے تمام علوم زوال پذیر ہیں یعنی ایک انسان دوسرے سے بڑھ کر علوم و فنون کی ایجاد کر سکتا ہے۔ اور ہر اگلا زمانہ پچھلے کے مقابلہ میں ترقی پذیر ہو سکتا ہے۔ تاہم قرآن اپنی جگہ پر مستحکم اور غیر زوال پذیر ہے دنیا کے سامنے بہت سارے نظام ہائے زندگی پیش کیے گئے۔ مگر کوئی نہ کوئی طاقت ایسی آتی

گئی جس نے پہلے اصولوں کا اپنے استدلال سے استیصال کر دیا۔ اور اس کے مقابلہ میں ایک نہ ایک نیا نظام لا کھڑا کیا۔ روس کو ناز ہے مارکس پر کہ اس نے ایک ایسا نظام مرتب کیا جس نے امیروں کے جور و استبداد سے غریبوں کو رہا کر دیا۔ امریکہ کو ناز تھا جارج واشنگٹن پر کہ اس نے ان میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں زندہ دل بنا دیا۔ اسی طرح اٹلی نے میزینی کا نظام پسند کیا کہ اس کے سبب ان میں حریت پیدا ہوئی مگر علمی دنیا میں یہ بات پوشیدہ نہیں رہی ہے کہ واشنگٹن۔ والنگٹن۔ بسمارک۔ میکارڈ۔ کا کوئی ایسا نظام نہیں ہے جسے کسی نہ کسی طاقت نے کچل نہ ڈالا ہو۔ اور پھر یہ اور اس سے زیادہ جس قدر بھی علوم وفنون ترقی کر جائیں وہ قرآنی علوم کے سامنے ٹمٹمائے ہوئے چراغ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بقول مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب ندویؒ کے کہ انسان کا علم مسافر ہے۔ مقیم نہیں وہ جتنا آگے بڑھتا گیا اس منزل کو پیچھے چھوڑتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ جہاں مذہب اور عقل کا ساتھ چلنا محال ہو گیا۔ مذہب اور سائنس کا تصادم ہوا اور یورپ میں مذہب کے زوال کا پہلا دن تھا۔ لیکن اسلام کی تاریخ میں واجبی طور پر یہ دن کبھی نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ اسلام میں اور قرآن میں انسانی عقلیات اور تخیلات نہیں ہیں جس پر انسان اپنا عقلی گھوڑا دوڑا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام اور قرآن کا عقل کے مطابق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ عقل کا معیار ہی تسلیم شدہ نہیں ہے۔ ایک مرتبہ سر سید مرحوم نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے ایک مکتوب کے ذریعہ معلوم کیا اور لکھا کہ دین کو عقل کے مطابق ہونا چاہیئے۔ تو مولانا نے جواب میں لکھا کہ یہ غلط ہے بلکہ عقل کو دین کے مطابق ہونا چاہیئے۔

چوتھا معجزہ : قرآن شریف کا ایک معجزہ غیبی علوم و معارف کا اظہار ہے جس کو نحن نقص علیك احسن القصص بما اوحینا الیك هذالقران وان کنت من قبله لمن الغافلین۔ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کو اس جگہ پر شبہ ہوا ہے کہ قرآن کے غیبی واقعات توریت وانجیل سے ماخوذ ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس توریت وانجیل سے لئے گئے ہیں۔ اگر وہ کتابیں مراد ہیں جو منزل من اللہ تھیں تو آج وہ دنیا سے ناپید ہیں نیز چونکہ یہ اعتراض متعصبین عیسائیوں کا من گھڑت افسانہ ہے بنا برین وہ قرآن کو موجودہ توریت وانجیل سے غیبی واقعات میں ماخوذ مانتے ہیں مگر یہ اعتراض کوئی جاہل یا قرآن و توریت سے ناواقف ہی کر سکتا ہے۔ جس نے بھی قرآن و توریت کا مطالعہ کیا ہے وہ ان متضاد بیانوں کی تصدیق کر سکتا ہے۔ چہ جائے کہ دونوں کو ایک کہدیا جائے جیسے توریت میں (۱) لوط علیہ السلام کا شراب پی کر اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا لکھا ہے (۲) اور

حضرت ہارون علیہ اسلام کا گئو سالہ پرستی کرنا توریت میں مذکور ہے (۳) اسی طرح داؤد علیہ اسلام کا اوریا کی بیوی بنت سبع سے زنا کرنا تحریر ہے (۴) حضرت سلیمان علیہ اسلام کا بت پرستی کرنا لکھا ہے وغیرہ۔

حالانکہ قرآن شریف بالکل اس کے برعکس کہتا ہے کہ وانهم عندنا لمن المصطفين الاخيار۔ وہ لوگ اللہ کے نزدیک برگزیدہ اور چنے ہوئے ہیں۔ اسلامی شریعت میں...... اهانة الانبیاء کفر کہا گیا ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام کی توہین کرنے والا کافر ہے ایک حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کا واقعہ لے لیجئے تورات میں ان کے متعلق یہ الفاظ ہیں۔

چونکہ ایسا ہوا کہ سلیمان علیہ السلام بوڑھا ہوا تو ان کی بیوی نے ان کے دل کو غیر معبود کی طرف مائل کر دیا اور اس کا دل اپنے خداوند کی طرف مائل نہ تھا جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا۔

لیکن قرآن نے سورہ (ص) میں ان کے اخلاص اور کامل عبدیت اور قرب کو کتنے صاف اور ستھرے الفاظ میں بیان کیا ہے وهبنالداؤ دسليمان نعم العبد انه اواب.

آگے چل کر ارشاد فرمایا۔ وان له عندنا لزلفى وحسن ماب . اب اس کے بعد بھی اگر قرآن کو توریت کا خوشہ چین کہا جائے تو سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ والله يهدى من يشاء الى صراط مستقيم .

آخر میں مختصر طور پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ کلام پاک انسان کے لئے بہترین شاہراہ ہے......

قرآن پاک اپنے دعوے میں سچا ہے وہ خدا کی کتاب ہے۔

اس میں ارسطو۔ افلاطون ۔ ڈیکارٹ ۔ میلیمر انس ۔ برکلے ۔ ابن رشد۔ ابن سینا۔ شیلنگ ۔ ہیگل ۔ کی اختراعات نہیں ہیں بلکہ یہ اس وحدہ لاشریك کی جانب سے بندوں کی جانب بھیجی گئی ہے۔ جو فلسفہ اور حکمت کی پرشوکت دھاندلی سے پاک اور ماورا ہے۔

مُستشرقین اور علم حدیث

مولانا حسنین احمد الندوی (ابوظہبی)

استشراق Orientalism کا اطلاق عام طور پر مغرب کی ان منظم کوششوں پر ہوتا ہے جسے وہ مشرقی علوم وفنون اور وہاں کی تہذیب وثقافت کو سمجھنے کے لئے کرتے ہیں البتہ عملی طور پر اس کا دائرہ کار اسلامی علوم وفنون اور مسلم تہذیب وثقافت کے مطالعہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

تحریک استشراق کا پس منظر

اس تحریک کا آغاز کب ہوا؟ اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ پھر بھی بعض محققین کا خیال ہے کہ اس کا آغاز ۱۳۱۲ء میں جنیوا میں کلیسا کے اس فیصلہ سے ہوا جس کے تحت یورپ کی کئی یونیورسٹیوں میں عربی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ البتہ یہ تحریک منظر عام پر ۱۷۸۳ء میں اس وقت آئی جب اس کی پہلی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔

اس تحریک کے پس پردہ عوامل میں سب سے اہم یہود ونصاریٰ کا وہ بغض ہے جس سے انکا دل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھرا ہوا ہے۔ یہود کے اس عداوت کی وجہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مدینہ میں ان کا راست ٹکراؤ ہے جس میں انہیں بدترین ہزیمت اٹھانی پڑی اور نہ صرف مدینہ اور خیبر بلکہ جزیرۃ العرب کو ہی خیر باد کہنا پڑا۔ جس کے بعد وہ صدیوں تک ذلت ومسکنت کی تصویر بنے بھٹکتے رہے۔ یہود چونکہ اس بدبختی کے لئے کافی حد تک اسلام اور مسلمانوں کو ذمہ دار سمجھتے ہیں اس لئے ہر وہ کام جس سے اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچے اس میں شرکت اپنے لئے دینی وملی فریضہ سمجھتے ہیں۔ مذکورہ تحریک میں بھی وہ اسی جذبہ کے تحت شریک ہوئے ہیں۔

یہود کی طرح نصاریٰ کو بھی مسلمانوں کے ہاتھوں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس طرح کے ان کے لاکھوں پیروکار عیسائیت کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایسے بہت سے ممالک جو کبھی عیسائیت کا گڑھ سمجھے جاتے تھے جیسے مصر، شام، فلسطین، اردن، اور لبنان وغیرہ یہ سب ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ اس کے تدارک کے لئے انہوں نے عالم اسلام کے خلاف متحدہ کوششیں بھی کیں جو تاریخ میں صلیبی

جنگوں کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ لیکن سو سال کی خونریز معرکہ آرائی کے باوجود ان کی کوششوں کا اختتام شرمناک ہزیمت پر ہوا اور ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح نے اس سلسلہ کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

یہ وہ تاریخی پس منظر تھا جس نے یہود و نصاری کو مسلمانوں کے خلاف تعاون پر آمادہ کیا اس کے نتیجہ میں بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں۔ مستشرقین کی مذکورہ تحریک بھی ان میں سے ایک ہے اس تحریک کے پس پردہ چونکہ شدت کے ساتھ مذہبی عوامل کار فرما تھے یہی وجہ ہے کہ یہود و نصادی کی اہم مذہبی شخصیتیں اس میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس تحریک نے عالم اسلام کے سیاسی اور اقتصادی استحصال میں پوری حکومتوں کی کافی مدد کی ہے پھر بھی مذہبی عوامل کو اس میں مرکزی مقام حاصل رہا ہے۔

تحریک استشراق کے بنیادی مقاصد

اس تحریک کے شروع سے ہی دو بنیادی مقاصد رہے ہیں۔ پہلا اسلام کے فکری و نظری سیلاب کے بڑھتے ہوئے ریلے پر بند باندھنا۔ تاکہ سارے یورپ کو اس میں بہہ جانے سے بچایا جا سکے۔ اس لئے کہ وہ اسلام کو ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت کے علاوہ فکر و عقیدہ کے اعتبار سے بھی اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے چنانچہ اس حقیقت کی جانب ڈبلو سی۔ اسمتھ W.C.Smith نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اسلام کا حملہ عملی ہونے کے ساتھ ساتھ نظری بھی تھا۔ اس نئے مذہب نے عیسائی مذہب کی بنیاد پر کاری ضرب لگائی جو کہ یورپ والوں کے لئے اعلی ترین عقیدہ تھا اور جس پر انہوں نے اپنی تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھی تھی۔ اسلام نے اسے پوری قوت کے ساتھ چیلنج کیا اور تقریباً نصف عیسائی دنیا میں اسے بھرپور کامیابی حاصل ہوئی۔

اسلام دنیا میں واحد مثبت طاقت ہے جس نے عیسائیت سے اس کے پیروکار چھین لئے۔ چنانچہ وہ لاکھوں کی تعداد میں عیسائی مذہب چھوڑ کر اس نئے دین میں داخل ہو گئے۔"

(W.C.Smith Islam in Modern History P166,4th ed 1966)

اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا۔ اسلام اور اہل اسلام کے بارے میں سارے یورپ میں انتہائی گھناؤنی اور بے بنیاد باتیں پھیلائیں مثلاً۔

(۱) اسلام عیسائیت کی مسخ شدہ شکل ہے۔

(۲) اسلام دہشت پسندوں کا مذہب ہے جو دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلا۔

(۳) اسلام شہوت رانی کی تعلیم دیتا ہے خاص طور سے جنسی بے راہ روی کی۔

(۴) پیغمبر اسلام ﷺ معاذ اللہ جنسی بے راہ روی کا شکار تھے۔ صنف نازک آپ کی کمزوری تھی۔
(۵) محمد ﷺ معاذ اللہ شیطان کے چیلے تھے۔ بعض نے تو اس تکلف کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور آپ ﷺ کو ہی شیطان قرار دے دیا۔ چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کے لئے لفظ ماھوند Mahound استعمال کیا ہے جس کے معنی شیطان کے آئے ہیں۔

مستشرقین کے صدیوں سے جاری اس زبردست پروپیگنڈہ کا اثر ہے کہ آج بھی یورپ کے کسی عام آدمی کے سامنے جب اسلام کا نام آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں مستشرقین کی بنائی ہوئی خوفناک تصویر ابھر آتی ہے اور وہ غریب اسے نہ صرف اپنے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے ایک شر اور خطرہ سمجھنے لگتا ہے۔

اس تحریک کا دوسرا ابنیادی مقصد مسلمانوں پر ہمہ جہت فکری حملہ تھا تا کہ انہیں ذہنی طور پر اس حد تک شکست خوردہ بنا دیا جائے کہ وہ اپنے دین و مذہب سے متعلق امور میں شکوک و شبہات کا شکار ہو جائیں۔ ان کا علمی و ثقافتی ورثہ خود ان کی نظروں میں بے وقعت ہو جائے اور ان کی حیثیت ایک مردہ تہذیب و ثقافت کے مجاور کی ہو کر رہ جائے۔

مستشرقین کا علمی و تحقیقی کام

مذکورہ مقاصد کی تکمیل کے لئے مستشرقین نے تلوار کے بجائے قلم کو منتخب کیا اور علم و تحقیق کے بینر کی آڑ میں اپنا کام شروع کیا۔ اس میں انہیں ہر مرحلہ پر مغربی حکومتوں کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف سرمایہ کی فراہمی یا کام کے مواقع سے متعلق انہیں کبھی کوئی دشواری پیش نہ آئی بلکہ انہیں علمی نوادرات اور نادر و نایاب مخطوطات سے استفادہ کا بھرپور موقع فراہم کیا گیا۔ اس طرح کہ جب مغربی ملکوں نے مسلم دنیا پر یلغار کی اور وہاں کے مال و دولت کو بڑے پیمانہ پر اپنے یہاں منتقل کیا تو اس موقع سے علمی نوادرات اور بعض قیمتی مخطوطات پر ہاتھ صاف کرنے سے نہ چوکے اور اسے بھی مال غنیمت کے طور پر اپنے یہاں لے گئے۔ ڈاکٹر مطفی السباعی اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"انیسویں صدی کے آغاز پر ہی یورپ کے کتب خانوں اور میوزیموں میں اس طرح کے نادر و نایاب مخطوطات کی تعداد ڈھائی لاکھ 2,50,000 تک پہنچ چکی تھی۔"

(الاستشراق والمستشرقون ص ۱۴)

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مذکورہ سہولتوں کے باوجود مستشرقین کوئی قابل ذکر علمی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ انہوں نے علم و تحقیق کے نام پر جو صفحات سیاہ کئے ہیں علم و تحقیق کی دنیا میں ان کا کوئی

مقام نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی مآخذ جیسے قرآن وحدیث اور پیغمبر اسلام سے متعلق انہوں نے جو اعتراضات اٹھائے ہیں اس میں بھی کوئی جدت نہیں ہے۔ وہ بھی صدیوں پرانے اور گھسے پٹے اعتراضات ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر حضور ﷺ کی زندگی میں ہی مشرکین مکہ اور یہود مدینہ نے اٹھایا تھا اور جن کا قرآن میں تفصیلی ذکر موجود ہے۔

چنانچہ قرآن سے متعلق انہوں نے جو اعتراضات اٹھائے ہیں وہ کچھ اس نوعیت کے ہیں۔

O و قال الذین کفروا ان هذا الا افك افتراه واعانه علیه قوم آخرون . الفرقان آیت:٤	کفار کا کہنا ہے کہ یہ من گھڑت باتیں ہیں جسے محمد ﷺ نے گھڑا ہے اور اس میں لوگوں نے ان کی مدد کی۔
O وقالوا اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملی علیه بکرة واصیلا. الفرقان ٥	اور کہتے ہیں کہ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جسے انہوں نے لکھ رکھا ہے یہ اسے صبح و شام پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔
O بل قالوا اضغاث احلام .انبیاء آیت : ٥	وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خواب پریشان ہیں۔
O وما هو بقول شاعر O قلیلا ماتؤمنون	یہ کسی شاعر کا کلام نہیں تم بہت کم ایمان لائے ہو
O ولا بقول کاهن O الحاقه آیت: ٤١ـ٤٢	اور نہ ہی کسی کاہن کا قول ہے۔
O وما هوبقول شیطان رجیم O اتکویر ص ٢٥	یہ شیطان مردود کلام نہیں ۔
O فقال ان هذا الا سحر یؤثر O المدثر ٢٤	یہ تو جادو ہے جو اگلوں سے منتقل ہوتا آیا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے متعلق ان کے اہم اعتراضات یہ ہیں۔

O قالوا ساحر او مجنون. الذاریات ٥٢	وہ اسے جادوگر یا دیوانہ کہتے ہیں۔
O انك لمجنون. الحجر.٦	تو تو دیوانہ ہے۔
O ولقد نعلم انهم یقولون انما یعلمه بشر ٥ النحل ١٠٣	اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ انہیں یعنی محمد ﷺ کو ایک آدمی سکھاتا ہے۔

اسی طرح مستشرقین نے اپنی تصانیف میں حقائق پر پردہ ڈالنے کے لئے جو ہتھکنڈے اپنائے ہیں جیسے کہ تحریف، تلبیس اور کتمان وغیرہ وہ بھی پرانے ہیں اور قرآن میں ان کی جانب مختلف مواقع پر اشارہ کیا جاچکا ہے۔

O ثم یحرفونه من بعد ماعقلوه وهم یعلمون .البقرہ ۷۵	پھر اسے سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر بدل دیتے ہیں۔
O ولاتلبسوالحق بالباطل وتکتموالحق وانتم تعلمون .البقرہ ۴۲	حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤاور سچی بات کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ۔
O یا اھل الکتاب لم تلبسون الحق بالباطل وتکتمون الحق و انتم تعلمون ۔ آل عمران ۷۱	اے اہل کتاب تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہواور جان بوجھ کر کیوں حق کو چھپاتے ہو۔
O یحرمون الکلم عن مواضعه ۔ المائدہ ۱۳	یہ لوگ کلمات کو جان بوجھ کر بدل دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر اعتراضات شیعہ 'معتزلہ اور خارجیہ وغیرہ کے کباڑ خانے سے نکالے ہوئے ہیں جس کا علماء حق کی جانب سے اس زمانہ میں مدلل جواب دیا جاچکا ہے۔

علم حدیث:

مستشرقین نے علم حدیث کی جانب کافی تاخیر سے توجہ کی۔ اس میدان میں سب سے پہلے جس قابل ذکر شخص نے قدم رکھاوہ گولڈ زیہر gold Ziher تھا۔ یہ جرمنی کا ایک یہودی تھا عربی زبان پر مکمل قدرت کی وجہ سے احادیث کے تمام اہم مآخذ پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس نے اپنی تحقیق ۱۸۹۰ء میں شائع کی'اس کے بعد دوسرا اہم نام ساخت کا ہے جس کی کتابیں اب تک مستشرقین کے لئے اہم مرجع ہیں۔ اس کے علاوہ اے ۔اسپرنجر A.Sprenger جی ۔ اشوک ھرگرونجی G.Sounck Huronfe ویسنک Wensick وغیرہ کا نام آتا ہے۔ ان سب کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ذخیرہ احادیث صحت متن اور سند ہر دو اعتبار سے مشکوک ہے۔ مستشرقین کی تحقیقات چونکہ خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے ہوا کرتی ہیں جس کی جانب اس سے قبل اشارہ کیا جاچکا ہے اس لئے ان کی تحقیق کے نتائج اس کے علاوہ کچھ اور ہو بھی نہیں سکتے۔

بعض خوش فہمیاں

بعض مستشرقین کے شخصی رجحانات' حالات کے تقاضے اور اس کے تحت ان کی بدلتی ہوئی ڈپلومیسی کا اثر ان کے کارناموں پر بھی پڑتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بعض امور سے متعلق راویوں کے اختلاف کے علاوہ ایک دوسرے پر شدید تنقید بھی ملتی ہے۔ اس سے بعض سادہ لوح لوگوں کو یہ خوش فہمی ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کے درمیان بعض علم دوست اور حقیقت پسند افراد بھی موجود ہیں جنہوں نے استشراق کے روایتی چوکھٹے سے نکل کر اپنی تحقیقات کے ذریعہ قابل قدر علمی خدمات انجام دی ہیں' مثال

کے طور پر اے جے ونسنک A.J. Wensinek کی ''مفتاح کنوز السنہ'' کو پیش کیا جاتا ہے جو کہ ''المعجم المفہرس لألفاظ الحدیث النبوی'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۳۶ء کے دوران آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی۔ یہ ان لوگوں کے خیال میں علم حدیث کی خصوصاً اور علم کی عموماً اتنی بڑی خدمت ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئیے کہ احادیث کا یہ انڈکس احادیث تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ ہے جسے بہتر مقاصد کے علاوہ مذموم مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب جن لوگوں کی کوششوں اور تعاون سے وجود میں آئی ہے اس کا مختصر سا جائزہ ہی اس کے علاوہ پس پردہ اغراض و مقاصد کی وضاحت کے لئے کافی ہوگا۔ چنانچہ اس کتاب کے مؤلف ونسک کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام کو میسیحت کی بگڑی ہوئی شکل سمجھتا ہے۔ وہ قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتا اور نہ ہی محمد ﷺ کو نبی مانتا ہے اسی طرح وہ احادیث کو اقوال رسول نہیں بلکہ اقوال صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ مانتا ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے اس کی تیاری میں تعاون کیا ہے ان میں سر فہرست تھومس آرنلڈ اور ہاملٹن ہیں ۔ جو اسلام سے اپنے بغض و عداوت کے لئے کافی مشہور ہیں۔ اور پھر اسی کتاب کی تیاری میں جن ملکوں نے مالی تعاون کیا ہے ان میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، اسکاٹ لینڈ اور سابق یوگوسلویہ جیسے ممالک پیش پیش ہیں جن کی اسلام اور مسلم دشمنی کوئی پوشیدہ چیز نہیں ہے ۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ انڈکس کی تدوین و ترتیب علم حدیث کی خدمت کے جذبہ سے نہیں بلکہ اس سے متعلق بعض مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے کی گئی ہے۔

مذکورہ کتاب اپنے منفی پہلوؤں کے باوجود ان لوگوں کے لئے بھی کافی مفید ہے۔ جو احادیث رسول ﷺ کے خدمت کے جذبہ سے اس میدان میں سر گرم عمل ہیں۔ لیکن اس موقع سے یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہئے کہ اسے مفید سے مفید تر بنانے میں مستشرقین کے علاوہ مسلمانوں کا بھی اہم رول ہے۔ چنانچہ شیخ محمد فواد عبد الباقی آفندی جنہوں نے اسے عربی قالب میں ڈھالا ہے۔ ترجمہ کے دوران اصل ماخذ سے رجوع کر کے احادیث تک پہنچنے کے لئے صحیح ترین الفاظ کا انتخاب کیا اور اس کتاب کے دوران ترتیب علامہ رشید رضا مصری سے برابر مشورہ لیتے رہے۔ اس کے علاوہ ''دار نشر اسلامی بھیونڈی بمبئی'' پریس کے مالک عبد الصمد شرف الدین نے اس کی نصف سے زیادہ کی طباعت کے دوران اس میں موجود بے شمار غلطیوں کی دینی جذبہ کے تحت تصحیح کی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی ترجمہ اصل کتاب سے زیادہ مفید بن گیا ہے۔

☆☆☆

مبارک کتاب کا بابرکت آغاز

مولانا بدر الحسن قاسمی (کویت)
معتمد تعلیم دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد

﴿دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد میں ۲۲/شوال ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۰/جنوری ۲۰۰۰ء کو حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری دامت برکاتہم نے جلسہ افتتاح بخاری شریف میں اس کتاب عظیم کی پہلی حدیث کا درس دے کر مدرسہ کے نئے تعلیمی سال کا آغاز فرمایا۔ اس موقع پر شہر اور ریاست آندھرا پردیش کے اضلاع سے کثیر تعداد میں علماء تشریف لائے تھے۔ اہل دین ودانش، اصحاب ذوق اور معززین کی بھی بڑی تعداد موجود تھی۔ اسی مبارک ومسعود جلسہ کی مناسبت سے محترم مولانا بدر الحسن قاسمی، معتمد تعلیم دار العلوم سبیل السلام (مقیم کویت) نے زیر نظر گرانقدر تحریر روانہ فرمائی تھی۔ ہم اس تحریر کو نہایت مسرت کے ساتھ افادۂ عام کی خاطر شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)﴾

"قرآن کریم" کے بعد جس کتاب کا ذکر صحت وصداقت کے لحاظ سے کیا جاتا ہے وہ امام بخاری کی "الجامع الصحیح" ہے جسے ہم صحیح بخاری کے نام سے جانتے ہیں۔

اللہ کی کتاب تو لفظ ومعانی ہر لحاظ سے وحی الٰہی ہے اور اپنے اعجاز وایجاز 'بلاغت ومعنویت اور صداقت وابدیت ہر پہلو سے تمام انسانی کوششوں سے ماوراء اور نبی رحمت ﷺ کی نبوت کی دلیل اور آپ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

لیکن وہ کتابیں جو انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ہیں خواہ وہ تفسیر وحدیث ہی کیوں نہ ہوں اللہ نے ان میں جو مقام امیر المؤمنین فی الحدیث امام محمد بن اسماعیل البخاری کی الصحیح کو عطا فرمایا ہے وہ شہرت اور مقبولیت کسی اور کتاب کو نہ مل سکی۔

بلاشبہ یہ بات امام بخاری کے اخلاص عمل 'بے مثال تقویٰ وطہارت کا کرشمہ اور علم حدیث میں ان کی عظمت وجلالت کا نتیجہ ہے کہ صدیاں گزر گئیں لیکن نہ تو کتاب کی تازگی میں فرق آیا اور نہ اس کتاب کی تعلیم وتدریس اور اس کے بارے میں تصنیف وتالیف سے شغف میں کمی آئی۔

چنانچہ علمائے امت نے رجال بخاری، اطراف بخاری، تراجم بخاری، شروح احادیث بخاری، مستخرجات ومستدرکات بخاری سے لے کر الفاظ بخاری کی تشریح اور حیات امام بخاریؒ کی تدوین و تنقیح پر ایک پورا کتب خانہ تیار کر دیا ہے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور انشاءاللہ تاقیامت جاری رہے گا۔

اس عظیم کتاب کی تالیف کے بارے میں ایک روایت تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ:۔

رایت النبی صلی الله علیه وسلم وکاننی واقف بین یدیه ' وبیدی مروحة اذبّ بها عنه . فسالت بعض المعبرین فقال لی انت تذب عنه الکذب فهو الذی حملنی علی اخراج الجامع الصحیح .

میں نے حضور اکرم ﷺ کو خواب میں اس حال میں دیکھا کہ گویا کہ میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ میں مور چھل (پنکھا) ہے جس سے میں آپ کی طرف سے مکھیاں بھگا رہا ہوں۔

جب خواب کی تعبیر بتانے والوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تم حضور ﷺ کی طرف سے جھوٹی باتوں کو دور کرو گے چنانچہ میرے جامع صحیح کے لکھنے کا یہی سبب ہوا)

قدرت کا فیصلہ تو ہو ہی چکا تھا امام بخاریؒ کے استاذ امام اسحٰق بن راھویہ کی زبان سے بھی یہ جملہ نکلا کہ "کاش تم لوگ صحیح حدیثوں کا ایک مختصر مجموعہ تیار کر دیتے" اور امام بخاری کے بعض ساتھیوں نے بھی یہ خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ امام صاحب فرماتے ہیں۔

فوقع ذلك فی قلبی فاخذت فی جمع هذا الکتا ب یعنی کتاب الجامع .

یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے اس کتاب کی تالیف شروع کر دی۔

ان وضاحتوں کے لئے فتح الباری کا مقدمہ دیکھنا چاہئے جس میں مختلف روایتوں کے ذریعہ کتاب کی تصنیف کے پس منظر پہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

لیکن سننے کی بات تو یہ ہے کہ کتاب کی تصنیف کا کام امام بخاری نے کس طرح مکمل فرمایا۔ ان کے نامور شاگرد فربری کا بیان ہے کہ۔

قال لی محمد بن اسماعیل البخاری ماوضعت فی کتاب الصحیح حدیثا الا اغتسلت قبل ذلك وصلیت رکعتین

مجھ سے امام بخاریؒ نے فرمایا کہ میں نے اپنی اس صحیح میں کوئی حدیث اس وقت تک نہیں لکھی جب تک کہ میں نے غسل کر کے دو رکعت نماز نہ پڑھ لی ہو (تہذیب التہذیب صفہ ۳۹/۹)

سمعت ابا عبدالله البخاری یقول صنفت کتاب الجامع فی المسجد الحرام وما ادخلت فیه حدیثا الابعد ما استخرت الله تعالی و صلیت رکعتین و تیقنت صحته.

میں نے ابو عبداللہ البخاری کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے اپنی صحیح مسجد حرام میں لکھی اور کوئی حدیث اس وقت تک اس میں نہیں لکھی جب تک کہ اللہ سے استخارہ نہ کرلیا ہو اور دو رکعت نماز نہ پڑھ لی ہو اور اس حدیث کی صحت کا پورا یقین نہ کرلیا ہو۔ (مقدمہ فتح الباری صف ۲۰۲)

مسجد حرام میں اس کے تصنیف کرنے سے مراد پوری کتاب وہاں بیٹھ کر تصنیف کرنا نہیں ہے کیونکہ دوسری روایتوں سے مدینہ طیبہ اور دوسرے مقامات پہ امام بخاری کا اس عرصہ میں موجود ہونا ثابت ہے لیکن ان کے بیان کا یہ جز کہ میں نے اس کتاب میں ایک حدیث بھی اس وقت تک شامل نہیں کی جب تک کہ اللہ تعالی سے استخارہ نہ کیا دو رکعت نماز نہ پڑھی اور اس کی صحت کا مجھے مکمل طور پر یقین نہ ہو گیا خاص طور پر قابل توجہ ہے' ظاہر ہے کہ جو کتاب اس شان سے لکھی جائے اللہ کی طرف سے اس کو قبولیت عطا ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے پھر قبولیت بھی کیسی ملی اس کا اندازہ اس بیان سے کیجئے۔

یقول الشیخ الامام ابوزید المروزی الذی هو اجل رواة البخارح عن الفربری قال : کنت نائما بین الرکن والمقام فرایت النبیﷺ فی المنام فقال لی : یا ابا زید الی متی تدرس کتا ب الشافعی ولا تدرس کتابی ؟ فقلت یا رسول الله وما کتابك : قال جامع محمد بن اسماعیل (مقدمہ فتح الباری صفہ ۲۰۳)

امام ابوزید مروزی کا بیان ہے جو صحیح بخاری کے بڑے اور اہم ترین ناقلین میں ہیں جنہوں نے امام بخاری کے شاگرد فربری سے اس کتاب کی روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں صحن کعبہ میں مقام ابراهیم اور رکن کے درمیان سویا ہوا تھا تو خواب میں حضور اکرمﷺ کو دیکھا انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم کب تک شافعی کی کتاب پڑھتے رہو گے اور میری کتاب نہیں پڑھو گے ؟ میں نے عرض کیا حضورﷺ آپ کی کتاب کونسی ہے تو آپﷺ نے فرمایا کہ محمد بن اسماعیل کی مرتب کردہ جامع (یعنی صحیح بخاری)

یہ وہ کتاب ہے جس کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں کہ۔

صنفت کتاب الصحیح لست عشر سنة خرجته من ستمائه الف حدیث وجعلته

میں نے صحیح کی تصنیف سولہ سال میں کی ہے اور اسے چھ لاکھ حدیثوں میں سے منتخب کیا

حجة بيني وبين الله . ہے اور اس کتاب کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنالی ہے۔

ان کے شاگرد فربری کا بیان ہے کہ۔

رايت النبی ﷺ فی المنام فقال لی : اين تريد ؟ فقلت أريد محمد بن اسماعيل فقال : اقرئه منی السلام . میں نے حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرمارہے ہیں کہ کہاں جارہے ہو؟ میں نے کہا محمد بن اسماعیل بخاری کے پاس تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ان سے میر اسلام کہو۔

محدث اعظم علامہ انور شاہ کشمیریؒ جن کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ میرے نزدیک مولانا انور شاہ کا وجود ہی اسلام کی حقانیت کی بڑی دلیل ہے۔
صحیح بخاری کے اسرار و رموز سے جس قدر وہ واقف تھے کئی صدیوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور جو اپنے علم و فضل کے لحاظ سے علامہ ابن حجر، علامہ بدرالدین عینی، حافظ عراقیؒ، امام ذھبیؒ، حافظ عبد البرؒ، قاضی عیاضؒ، علامہ ابن جوزیؒ، حافظ ابن رجبؒ، وغیرہ کی صف میں جگہ پانے کے مستحق تھے ان کا بیان ہے کہ میں نے صحیح بخاری کی تدریس کا منصب سونپے جانے سے پہلے اس کتاب کا پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ اول سے آخر تک ۱۳ بار مطالعہ کیا تھا۔

ان کے شاگرد رشید علامہ محمد یوسف البنوریؒ فرماتے ہیں۔

طالعه قبل شروعه فی تدريسه ثلاث عشر مرة من اوله الی اخره مطالعة بحث و تحقيق وطالع شروحه المطبوعه من الفتح والعمدة والارشاد وغيرها من المطبوعه والمخطوطه.

انہوں نے نے اس کتاب کی تدریس سے پہلے ۱۳ بار شروع سے آخر تک اس کا مطالعہ اور تمام مطبوعہ و مخطوطہ شرحیں پڑھ لیں تھیں جن میں فتح الباری عمدۃ القاری اور قسطلانی شامل ہیں۔

(مقدمہ فیض الباری صفحہ ۳۱)

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی درسی تقریروں کا مجموعہ "فیض الباری" اور ان کی دوسری کتابوں سے اندازہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کی نظر کتنی دقیق اور ان کا علم کتنا حاوی اور بخاری کے اسرار و رموز کو کس قدر محیط تھا اس کے باوجود وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہر بار پڑھنے میں نئے معانی اور نئے رموز و اسرار کھلتے رہتے ہیں۔

یزیدك وجهه حسنا   اذا ما زدته نظرا

حضرت شاہ صاحب نے حدیث ہی نہیں عربی زبان کا صحیح ذوق حاصل کرنے کے لئے بھی صحیح بخاری کی اہمیت کا ذکر کیا ہے اور ایک شخص کا یہ مقولہ نقل کیا ہے۔

من أراد العربیه کفی له القران و کتاب البخاری والهدایة.
جس کو عربی زبان چاہئے اس کے لئے قرآن کریم صحیح بخاری اور ہدایہ کافی ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی لازوال و بے مثال تصنیف "الجامع الصحیح" میں کیا کیا باریکیاں ملحوظ رکھی ہیں اور ۱۶ سال کی طویل مدت تک غسل اور استخارہ کا اہتمام و التزام کرتے ہوئے اس میں کیسے کیسے علمی لعل و گہر بکھیرتے گئے ہیں اور اللہ تعالی نے اس پر علمی فتوحات کے کتنے دروازے کھولے ہیں اور حدیث رسول ﷺ کے بحر ناپیدا کنار کی تہوں سے وہ کیسے کیسے موتی چن کر نکال لائے ہیں۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے خاص طور پر حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی عظیم کتاب فتح الباری کا گرانقدر مقدمہ "ھدی الساری" امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے امالی میں بکھرے ہوئے نکات اور علمی لطائف اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی جامع کتاب "الابواب والتراجم" اور لامع الدراری" کا مقدمہ دیکھنا چاہئے جن میں صحیح بخاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے اندازِ تصنیف اور خاص خاص اشاروں کو واشگاف کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حدیث کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے یا مکرر لانے میں امام ہمام نے کیا باریکیاں ملحوظ رکھی ہیں، قرآن حکیم کی آیات کا کس طرح استعمال کیا ہے۔ کتاب کے شروع اور آخر میں کیا مناسبت ملحوظ رکھی ہے۔ ہر کتاب کے آخر میں خود پڑھنے والے کو زندگی کے اختتام کی یاد دہانی کے لئے کسی مناسب لفظ کے استعمال، مشکل الفاظ کی تشریح کا نرالا انداز، ایسی روایتوں کا لانا جو "ثلاثیات البخاری" سے جانی جاتی ہیں۔ اور جن کی سند اتنی عالی ہے کہ امام بخاری اور حضور اکرم ﷺ کے درمیان صرف تین راویوں کا واسطہ باقی رہ جاتا ہے ایسی حدیثوں کی مجموعی تعداد ۲۲ بتلائی گئی ہے جن میں سے ۱۱ مکی بن ابراہم کی روایت سے ہیں جو امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔

امام بخاریؒ نے ابواب کی ترتیب میں بھی اور عنوانات قائم کرنے میں بھی بڑی باریکیاں ملحوظ رکھی ہیں جہاں تک ان ابواب و تراجم کا تعلق ہے اور جس کے بارے میں کہا گیا ہے "فقہ البخاری فی تراجمہ" اور یہ حقیقت بھی ہے کہ امام بخاری نے ان "عنوانات" ہی کے ذریعہ سیکڑوں مسائل کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے اور حقیقت میں ان "ابواب و تراجم" ہی سے ان کی ذکاوت و ذہانت اور فقہی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان تراجم کو حل کرنے اور زیر عنوان احادیث سے ان کی مناسبت تلاش کرنے کی کوشش بڑے بڑے ائمہ فن نے کی ہے۔ اور خاص اس موضوع پر علحدہ کتابیں لکھی ہیں۔ اور علامہ ابن المنیرؒ علامہ الدمامینؒ، علامہ المغراویؒ، بدرالدین البلقینیؒ وغیرہ علمائے متقدمین کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلویؒ، شیخ الھند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سبھی نے خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن اس موضوع کی تکمیل کا شرف شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کو حاصل ہوا۔ جن کی کتاب پچھلی تمام کتابوں کا خلاصہ ہے اور خود انہوں نے بھی اپنی پچاس سالہ تدریس بخاری کے تجربات سے بہت سی باتوں کا اضافہ کیا ہے انہوں نے مجموعی طور پر ستر ۷۰ اصول ذکر کیئے ہیں لیکن اب بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان پہ مزید اضافہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ لیکن اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سب سے جامع بلاشبہ یہی کتاب ہے نئے حالات اور مسائل آج بھی فن حدیث سے شغف رکھنے والے اور صحیح بخاری کی تفہیم و تشریح میں نکتہ آفرینوں کے خوگر طلبہ اور اساتذہ سے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ طبع آزمائی کا سلسلہ جاری رکھیں۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

"صحیح بخاری" کے درس کے آغاز کی اس مبارک تقریب میں حاضری تو مجھے خود بنفس نفیس دینی چاہیئے۔ یہ دار العلوم سبیل السلام سے تعلق اور نسبت کا تقاضا بھی تھا اور کتاب کی عظمت کا بھی۔ لیکن میرا حال تو معلوم ہی ہے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یہ بات خوشی کی ہے کہ اس مبارک تقریب کے لئے حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے لائق و فائق فرزند اور دار لعلوم دیوبند (وقف) کے شیخ الحدیث حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری آپکے درمیان ہیں یہ انتخاب فال نیک ہے اس کا لازمی اثر حدیث کے طلباء کو یہ لینا چاہیئے کہ علم حدیث کو حاصل کرنے میں ہماری منزل وہ ہونی چاہیئے جو امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تھی یقین جانئے کہ جس دن آپ نے یہ فیصلہ کر لیا صحیح بخاری کے اسرار و رموز آپ کے لئے آسان ہو جائنگے علامہ انور شاہ صاحب نے اس بحر کی شناوری کس طرح کی ہے اس کا ندازہ کرنے کے لئے "فیض الباری" رسائل الامام الکشمیری" اور معارف السنن للبنوری" کا مطالعہ کیجئے تو احساس ہوگا کہ امام ذھبیؒ ابن دقیق العیدؒ ابن تیمیہؒ اور ابن حجرؒ کے ساتھ اپنے روز و شب گزار رہے ہیں۔

دار العلوم سبیل السلام ایک تعلیم گاہ کی حیثیت سے اپنے اندر طالبان علوم نبوت کو علم کی نئی راہیں دکھلانے کے (اللہ کی توفیق سے) بڑے امکانات رکھتا ہے لیکن یہ بات طلبہ، اساتذہ اور منتظمین سبھوں

کے یکساں طور پر جذبہ اور اخلاص عمل پہ موقف ہے۔

موجودہ زمانے میں حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتدریس کے ساتھ بہت سی نئی ذمہ داریاں بھی علوم حدیث سے وابستگی رکھنے والوں کے سر آگئی ہیں۔ اس لئے میری رائے میں درج ذیل خطوط پہ ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا چاہیئے۔

(۱) حدیث کے درس وتدریس کا محور محض احادیث احکام کے چند ابواب نہیں احادیث کا مکمل ذخیرہ ہونا چاہیئے اور آداب، زہد ورقائق کے ابواب کو بھی اتنی ہی اہمیت سے پڑھنا پڑھانا چاہیئے جتنی اہمیت اختلافی مسائل کو دی جاتی ہے موجودہ تہذیب وتمدن نے انسانوں کو مادیت کے غلبہ کی وجہ سے تباہی کے جس کنارے پہ پہنچادیا ہے اس کا علاج، رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسئلہ پہ پنجہ آزمائی میں نہیں ہے مشکاۃ نبوت سے نکلے ہوئے ان زرین اقوال میں ہے جو عام طور پر زہد ورقائق اور آداب کے ذیل میں آتے ہیں۔ ایمان میں نقص وزیادتی کا اختلاف لفظی اور ہر گروہ کے منشاء اختلاف کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے اس بحث میں اس طرح الجھ جانا کہ ایمان کے تقاضوں سے ہی آدمی غافل ہو جائے اور نہ یہ فکر رہے کہ اہل ایمان کی تعداد میں کس طرح اضافہ ہو اور نہ یہ ہوش رہے کہ جو اہل ایمان ہیں انمیں سچا اور راسخ ایمان کس طرح پیدا کیا جائے جس سے حالات میں سدھار ہو اور ایمان کا جھونکا باطل کے خس وخاشاک اڑالے جائے اور دنیا میں ہر طرف ایمان کی بہار آجائے یقیناً توجہ طلب بات ہے۔

(۲) حدیث کی تدریس محض بعض لفظی اشکال دور کرنے تک محدود نہ ہو بلکہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا کی مشکلات کا جو حل نکلتا ہے وہ پیش کرنے کی صلاحیت بھی ہم میں پیدا ہو اور ہم بجا طور پر امت کی رہنمائی کر سکیں اور انسانیت کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے نشان راہ کی طرف لا سکیں اور اسے اسلامی تعلیمات سے روشناس کرا سکیں۔

(۳) حدیث کے علم میں ہمیں کمال تک پہنچنا چاہیئے اور جن لوگوں میں فطری جوہر موجود ہو ان کا علم محض شروح وحواشی تک محدود نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان کو علم وتحقیق کے میدان میں آگے بڑھ کر ان ذخائر سے بھی استفادہ کرنا چاہیئے جو اب چھپ کر منظر عام پہ آگئے ہیں۔ اور جن کو دیکھنے کی حسرت اکابر اہل علم اپنے سینوں میں لیکر چلے گئے۔ سنن، مسانید، مصنفات، اور اصول ومصطلح حدیث کی سینکڑوں کتابیں تحقیق وتعلیق کے ساتھ آج دستیاب ہیں جن سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔

(۴) موجودہ زمانہ میں فقہی مسائل میں ائمہ مذاہب کے اختلاف کا مطالعہ موازنہ اور مقارنہ کے انداز

پہ ہونا چاہیئے۔ مناظرہ اور افحام خصم (فریق مخالف کی بولتی بند کر دینے کے) انداز پہ نہیں نیز تمام ائمہ کے مسلک کی کتابیں اب دستیاب ہیں اس لیئے کسی کی طرف مسئلہ کی نسبت کرنے سے پہلے پوری تحقیق اس مذہب کی اصل کتابوں سے کرلینا چاہیئے۔

(۵) اختلافی مسائل میں علامہ کشمیریؒ کے طرز تحقیق سے فائدہ اٹھانا چاہیئے جن کے بارے میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا بیان ہے کہ :

اذا تجاذبت الاحادیث وتضاربت نصوص الشارع ولم يتعين غرض الشارع بيقين وكان الكل سائغا عنده فيحمل اختلاف الائمة فى امثال هذا على الاولوية ولم يكن يزعمه مخالفا للمذهب.

جب احادیث ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں اور نصوص میں تعارض ہوتا اور شارع کا مقصد یقینی طور پر متعین نہیں ہو پاتا تو آپ کے یہاں ساری شکلیں قابل قبول ہوتیں اور ان مسائل میں ائمہ کے اختلاف کو وہ اولی اور غیر اولی کا اختلاف سمجھتے اور کسی پہلو کو بھی مذہب کے خلاف نہیں سمجھتے۔

مثال میں اذان میں ترجیع کی بحث، آمین بالجہر اور رفع یدین وغیرہ کے مسائل صراحت کے ساتھ انھوں نے لکھے ہیں۔ اور خود فقہ حنفی میں بھی وہ قول جو حدیث نبوی سے زیادہ قریب ہو ااس کے تتبع کا شاہ صاحب کو خاص اہتمام ہوا کرتا تھا۔

وانه اذا تعين غرض الشارع ولم يجد فى الباب روايته عن الام توافقه بل صادق رواية عن الصاحبين اوأحدهما فكان هو المذهب الحنفى عنده مثاله مسالة الخمر فكان يقول غرض الشارع هوالنهى عنها سواء كان من العنب اوغيره وسواء كان قليلا أوكثيرا وسواء اسكرقليله اولم يسكر واليه ذهب الجمهور وأبو يوسف وهومن اصحابه فتعين المصير اليه (مقدمہ فیض الباری)

اور جب شارع کا مقصد متعین ہوئے جا اور امام ابو حنیفہ سے براہ راست کوئی روایت ایسی منقول نہ ہو جو اسکے مطابق ہو اور صاحبین یا انمیں سے کسی ایک سے روایت منقول ہو تو شاہ صاحب کی نظر میں مذہب حنفی وہی قرار پاتا ہے مثال کے طور پر شراب کے مسئلہ میں وہ فرمایا کرتے تھے کہ شارع کا مقصد شراب سے روکنا ہے چاہے وہ انگور سے بنی ہو یا کسی اور چیز سے کشید کی گئی ہو اور تھوڑی ہو یا زیادہ اور اسکی کم مقدار نشہ لاتی ہو یا نہ لاتی ہو ہر حال میں ممنوع

ہے جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام ابو یوسفؒ کی
رائے بھی یہی ہے جو امام صاحب کے شاگرد اور
ہم مشرب ہیں لھذا اسی کو اختیار کیا جائے گا۔

یہ وہی محققانہ انداز ہے جس کی دعوت حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی نے "فیوض الحرمین" میں دی ہے اور فقہ حنفی کے دائرہ میں رہتے ہوئے تطبیق سنت کے "طریقہ انیقہ" کی نشاندہی کی ہے۔

موجودہ زمانے میں حدیث کے نئے دستیاب ذخائر کی روشنی میں مولانا عبداللہ شاہ حیدر آبادیؒ کی "زجاجة المصابیح" اور مولانا ظفر احمد تھانویؒ کی " اعلاء السنن" اور علامہ شوق نیمویؒ کی " آثار السنن" جیسے کاموں کی تکمیل کے مزید وسائل فراہم ہوگئے ہیں۔ ضرورت ہے ہمت شوق، اور جذبہ کی اور اس اخلاص عمل کی جسکی دعوت امام بخاری نے پہلی حدیث کے ذریعہ دی ہے۔

مستقبل میں حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم سبیل السلام کی نگرانی میں علمی و تحقیقی کاموں کے امکانات کافی روشن ہیں۔

اللہ سے دعا ہے سبیل السلام کو ہر طرح کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کا شرعی حکم

بدرالحسن قاسمی

"میت کی لاش کا پوسٹ مارٹم" اب محض ایک طبی ضرورت ہی نہیں رہی بلکہ تفتیش جرائم کیلئے قانون وانصاف کے شعبہ میں بھی اس کا سہارا لینا ناگزیر ہوگیا ہے جہاں تک طبی ضرورت کا تعلق ہے تو مرض کی شناخت اور اس کے لیے صحیح دوا کی تجویز اسی وقت ممکن ہے جبکہ معالج انسانی جسم کے دروبست سے پوری طرح واقف ہو اور مختلف اعضاء کے درمیان جو ربط وتعلق ہے اس سے باخبر ہو تاکہ دواؤں کی تجویز میں توازن برقرار رکھ سکے چنانچہ سرجری یا علم تشریح اعضاء کو قدیم زمانے سے ڈاکٹری کی تعلیم کا ایک لازمی جز سمجھا جاتا رہا ہے اور اب تو سرجری کے میدان میں میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اس کے بغیر معالجہ کا تصور ہی نہیں رہا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا عمل جس میں انسانی جسم کی قطع وبرید اور چیر پھاڑ کے بغیر کام نہ چلتا ہو اس کی از روئے شرع کیونکر گنجائش ہوسکتی ہے؟ جبکہ شریعت نے لاش کی حرمت بھی اسی طرح برقرار رکھی ہے جس طرح زندہ انسان کی، اور مردہ کے جسم سے تعرض کو بھی اسی طرح ناجائز قرار دیا ہے جس طرح زندہ کے جسم کی اہانت اور اس میں قطع وبرید کو ناجائز قرار دیا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے۔

كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ حَيًّا۔ مردہ کی ہڈی توڑنا، زندگی کی حالت میں اس کے توڑنے ہی کے مرادف ہے۔

اس لیے سوال کے جواب سے پہلے ہمیں ان مقاصد پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے جن کیلئے اس عمل کا عموماً ارتکاب کیا جاتا ہے۔

لاشوں کے پوسٹ مارٹم سے عام طور پر درج ذیل مقاصد پورے ہوتے ہیں۔

(۱) مشتبہ حالت میں واقع ہونیوالی موت کے بارے میں تفتیش جرائم کا محکمہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ مرنے والے کی موت گلا گھونٹنے سے ہوئی ہے یا پانی میں ڈوب کر یا زہر کھانے سے یا کسی اور خفیہ سبب کے نتیجہ میں تاکہ مجرم کی شناخت اور اس کے لیے سزا کی تجویز ممکن ہوسکے اس سے بلاشبہ مجرمین کی سرکوبی

اور معاشرہ میں امن وامان قائم کرنے میں مدد ملتی ہے اور عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔

دوسرا پہلو اس کا یہ بھی ہے کہ بسا اوقات ایک بے قصور آدمی اشتباہ میں پکڑا جاتا ہے لیکن لاش کے پوسٹ مارٹم سے قطعیت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس پر فرد جرم غلط قائم ہوئی ہے اور مرنیوالا خود اپنی طبعی موت مرا ہے یا اس نے خودکشی کی ہے اور اس طرح وہ ناکردہ گناہ کی سزا بھگتنے سے بچ جاتا ہے اور بے قصور آدمی کی جان بچ جاتی ہے جو شرعاً مطلوب ہے۔

(۲) کسی وبائی مرض کے پھیلنے کے زمانہ میں پوسٹ مارٹم کے ذریعہ صحت کے محکموں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اس بات کا پتہ لگا سکیں کہ کثرت سے موت واقع ہونے کے اندرونی اسباب کیا ہیں تاکہ احتیاطی تدابیر اختیار کر سکیں۔

(۳) ڈاکٹری کے وہ طالب علم جن کا موضوع سرجری یا تشریح الاعضاء ہو وہ اساتذہ کی نگرانی میں لاش کو کھول کر انسانی اعضاء کی ترکیب، ہڈیوں کے جوڑ، مختلف اعضاء کے درمیان تناسب وغیرہ کو اس مقصد کے لئے دیکھتے ہیں تاکہ مرض، اس کے اسباب اور طریق علاج کو صحیح طور پر سمجھ سکیں تاکہ جب علاج ومعالجہ کے میدان میں قدم رکھیں تو بصیرت کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کر سکیں۔

جہاں تک ان مقاصد کے بارے میں شریعت کے موقف کا تعلق ہے تو کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام نے انسان کی جان، مال، عقل، نسل اور دین کی حفاظت ہی کی خاطر قواعد واصول مرتب کئے ہیں، حدود اور سزائیں متعین کی ہیں اس لیے ان مقاصد کو بروئے کار لانا نہ صرف یہ کہ شرعاً جائز ہے بلکہ بعض حالتوں میں واجب اور ضروری بھی ہے جس سے غفلت باز پرس کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

حربی کافر اور مرتد کا قتل شریعت میں دین کی حفاظت کی خاطر مشروع کیا گیا ہے، اور قصاص سے لوگوں کی جان کی حفاظت مقصود ہے، زنا کی سزا کا مقصد نسل کی حفاظت ہے، اور چور اور غاصب کی سزا مال کی حفاظت کی خاطر رکھی گئی ہے اور شراب کی سزا عقل کی حفاظت کیلئے ہے۔

ویسے تو شریعت کے تمام احکام میں بندوں کی دنیا و آخرت کی مصلحتیں ہی ملحوظ رکھی گئی ہیں لیکن اصولی طور پر بعض مصلحتیں ایسی ہیں جن کو شریعت نے معتبر مانا ہے اور ان پر احکام کا مدار رکھا ہے اور بعض ایسی ہیں جن کو شریعت نے باطل اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ جیسے شراب اور سود کی بعض ظاہری اور محسوس منفعتیں کہ جن کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ خود قرآن میں شراب اور جوئے کی ان ظاہری منفعتوں کی طرف اشارہ کرنے کے باوجود ان کو یہ کہہ کر حرام قرار دیا گیا ہے کہ ان کی مضرتیں منفعت پر غالب ہیں۔ ارشادِ باری ہے۔

قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا (البقرہ ۲۱۹)

آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کیلئے کچھ منفعتیں بھی ہیں لیکن ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھکر ہے۔

اب زیر نظر مسئلہ کے بارے میں شرعی حکم جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بعض اُن فقہی نظائر پر بھی ایک نظر ڈالیں جن میں مضرتوں پر مصلحت کے غالب ہونے کی بنا پر فقہا نے معمولی مضرت کو برانگیز کرنے اور عمومی مصلحت کے مطابق عمل کرنے کو شرعاً جائز قرار دیا ہے۔

ا۔ ایک مسلم کا خون دوسرے مسلمان کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے، اور دوسری طرف کفار سے جہاد فرض ہے، اب جنگ کے دوران اگر کفار چند مسلمانوں کو یرغمال بنالیں اور انہیں بطور ڈھال استعمال کرنے لگیں اور جب مسلمان کفار پر حملہ کا ارادہ کریں تو وہ ان مسلمانوں کو آگے کر دیا کریں تاکہ مسلمان ان کی وجہ سے حملہ سے باز رہیں ایسی صورت میں جبکہ کفار کا لشکر مسلمان قیدیوں، عورتوں یا بچوں کو ایک جنگی تدبیر کے طور پر استعمال کر رہے ہوں اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کی عمومی مصلحت کو نقصان پہنچ رہا ہو اور مسلمان لشکر کے شکست کھا جانے کا اندیشہ ہو تو شرعاً جائز ہے کہ عمومی مصلحت کی خاطر چند جانوں کی قربانی گوارا کی جائے۔ ایسی صورت میں مسلمان لشکر کے حملہ سے جن مسلمانوں کا خون ہوگا وہ قتل نفس کے ضمن میں نہیں آئے گا اور حرمت کے عام حکم سے یہ صورت اس لیے مستثنا ہوگی کہ مقصود ان کا قتل نہیں کفار پر حملہ ہے۔

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

فلا بأس بارسال الماء الٰی مدینة اهل الحرب واحراقهم بالنار ورميهم بالمنجنيق وان كان فيهم اطفال اوناس من المسلمين اسرى او تجّار.

اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ برسر پیکار (اہلِ حرب) کفار کے شہر میں پانی کھول دیا جائے یا انہیں آگ سے جلا دیا جائے یا توپ سے ان پر حملہ کیا جائے اگرچہ ان کے درمیان بچے یا کچھ مسلمان قیدی یا تاجر کی حیثیت سے ہی کیوں نہ ہوں۔

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:

وكذلك ان تترسوا باطفال المسلمين فلا بأس بالرمى اليهم وان كان الرامى يعلم انه يصيب المسلم. (۱)

اسی طرح اگر کفار (جنگ کی حالت میں) کچھ مسلمان بچوں کو ڈھال بنالیں تو نشانہ کا رخ ان کی طرف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگرچہ نشانہ باز کو اس کا علم ہی کیوں نہ ہوکہ اسکی زد مسلمان پر پڑے گی۔

امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب مبسوط میں جہاں اس مسئلہ پہ گفتگو کی ہے اس کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں اور ان فقہاء کی آراء کی تردید بھی کی ہے جو یہ خیال نہیں رکھتے (۲)۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

اذا كان في حصن المشركين نساء واطفال واسرى مسلمون فلا بأس بأن ينصب المنجنيق على الحصن دون البيوت التي فيها الساكن الّا أن يلتحم المسلمون قريب من الحصن فلا بأس ان ترمى بيوته وجدرانه. (۳)

اگر مشرکین کے قلعہ میں کچھ عورتیں، بچے اور مسلمان بھی ہوں تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ قلعہ کو توپ کا نشانہ بنایا جائے البتہ خاص طور پہ ان گھروں کو نشانہ نہ بنایا جائے جن میں وہ مقیم ہوں لیکن جب مسلمان قلعہ سے قریب ہو جائیں (اور دست بدست جنگ چھڑ جائے) تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ گھروں کو نشانہ بنایا جائے۔

ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

وان تترسوا في الحرب نسائهم وصبيانهم جاز رميهم ويقصدا المقاتلة لان النبى صلى الله عليه وسلم رماهم بالمنجنيق ومعهم النساء والصّبيان و لان كف المسلمين عنهم يفضى الىٰ تعطيل الجهاد (۴)

اگر کفار جنگ کے دوران اپنی عورتوں اور بچوں کو ڈھال بنالیں تو بھی ان پہ حملہ کرنا جائز ہے اور اس حملہ کا مقصد برسرپیکار لوگوں کو قتل کرنا ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو منجنیق (توپ) کا نشانہ بنایا تھا حالانکہ ان کے ساتھ بچے اور عورتیں بھی تھیں، کیوں کہ اگر کفار کی اس تدبیر کی بنا پہ مسلمانوں کو حملہ سے روک دیا جائے تو جہاد ہی معطل ہو کر رہ جائے گا۔

۱۔ مالکیہ اور دوسرے فقہاء کا بھی یہی مذہب ہے۔

۲۔ عام حالت میں مردہ کی لاش کو چاک کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح زندہ کے جسم کو، لیکن اگر عورت حمل کی حالت میں مرگئی ہو اور اسکے پیٹ میں زندہ بچہ موجود ہو تو اس کا پیٹ چاک کرنا شرعاً جائز ہوگا تا کہ معصوم بچہ کی جان ضائع نہ ہو اور اس سے جو لاش کی بے حرمتی ہوتی ہو اس کو مصلحت کی خاطر گوارا کیا جائیگا۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

ولوماتت امرأة حامل والولد حي يتحرك قد تجاوز ستة اشهر فإنه يشق بطنها طولا ويخرج الولد لقول الله تعلى (ومن احياها

گر کوئی حاملہ عورت مرجائے اور اس کا بچہ (پیٹ میں) زندہ ہو اور حرکت کر رہا ہو جس کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہو تو اس عورت کا پیٹ سیدھا (لمبائی میں) چاک

(۱) و (۲) المبسوط ج ۱۰ ص ۶۴-۶۵ (۳) کتاب الام ج ۴ ص ۲۸۷ (۴) المغنی الشرح الکبیر ج ۲ ص ۴۰۷-۴۰۸

فکأنما احیا الناس جمیعاً) ومن کیا جائے گا اور بچہ کو نکال لیا جائے گا کیوں کہ خداوند ترکہ عمداً حتی یموت فھو قاتل قدوس کا ارشاد ہے کہ جس نے اس کو (ایک جان کو) زندہ نفسِ.(۱) کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی اور اگر کوئی شخص جان بوجھ کر بچہ کو چھوڑ دے تا کہ بچہ کی موت واقع ہو جائے تو وہ قتل نفس کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

ائمہ اربعہ کے مذاہب میں بھی ایسے اقوال موجو ہیں جن سے زندہ بچہ کو نکالنے کے لیے مردہ عورت کا پیٹ چاک کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ خنزیر کا گوشت، یا مردار کا کھانا عام حالتوں میں تو شریعت نے حرام قرار دیا ہے لیکن اگر کوئی شخص اضطرار کی حالت کو پہنچ جائے اور اسے اپنی جان بچانے کیلئے ان حرام چیزوں کے استعمال کے علاوہ کوئی دوسری چیز دستیاب نہ ہو تو اس کیلئے اپنی جان بچانے کی خاطر مردار یا خنزیر تک کے کھانیکی اجازت دی گئی ہے۔ حتی کہ بعض فقہاء کے قول کے مطابق اگر مردہ انسانی لاش کے علاوہ اور کوئی چیز دستیاب نہ ہو تو اسے بھی کھانے کی اجازت ہے۔

۴۔ شریعت کے عام اصول کی رو سے ہر شخص کی جان یکساں قیمت رکھتی ہے اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے کو قتل کرے لیکن اگر چند اشخاص ایک کشتی میں سوار ہوں اور کشتی کے ڈوبنے کا اندیشہ ہو اور اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ جائے کہ کشتی کا وزن کم کرنے کے لیے ایک آدمی کو دریا میں ڈال دیا جائے تا کہ دوسروں کی جان بچ سکے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں صرف ایک آدمی کی جان جاتی ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو دسیوں آدمیوں کی جان جا سکتی ہے اس مصلحت کے پیش نظر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے کہ قرعہ اندازی کر کے ایک کو سمندر کی نذر کر دیا جائے تا کہ دس کی جان بچ سکے

ان تمام مسائل میں اگر غور کیا جائے تو قدر مشترک یہی بات نکلتی ہے کہ عمومی مصالح کی خاطر انفرادی نقصان کو انگیز کیا جا سکتا ہے۔ یا دو برائیوں میں سے جب آدمی کو اس طرح پر سابقہ پیش آئے کہ ان میں سے ایک کو اختیار کئے بغیر چارۂ کار ہی نہ ہو تو وہ صورت اختیار کی جائے گی جس میں برائی کمتر درجہ کی ہو۔

ان ہی نظائر کو سامنے رکھ کر موجودہ زمانہ کے فقہاء وارباب افتاء کا عام رجحان یہی ہے کہ پوسٹ مارٹم میں جو فوائد ہیں ان کے پیش نظر لاش کی قطع و برید سے ہونے والی اہانت گوارا کی جائیگی خاص طور پر جبکہ پوسٹ مارٹم کا مقصد لاش کی اہانت ہرگز نہیں ہوا کرتی۔ لیکن اس میں بھی یہ احتیاط ضروری ہے کہ تعلیم کے مقصد سے پوسٹ مارٹم کیلئے ان لاشوں کا استعمال کیا جائے جو لاوارث اور غیر معصوم ہوں۔ مسلمان کی لاش کو انتہائی مجبور کن حالات کے علاوہ ہاتھ نہ لگایا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

بارہواں فقہی سیمینار

○ نشہ کی طلاق ○ انٹرنیٹ ○ اختلافات ائمہ

مباحث، تجاویز، تاثرات

محمد رضوان القاسمی

عالمی مذاہب میں بلاشبہ یہ امتیاز اور خصوصیت مذہبِ اسلام کو حاصل ہے کہ وہ تغیر پذیر دنیا (Changing world) میں جدید اور نئے مسائل کا کامیاب اور اطمینان بخش حل لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام آسمانی اور خدائی دین کا آخری ایڈیشن ہے' جو زمان و مکان کی تمام تنگنائیوں اور حد بندیوں سے ماوراء ہے' اور قیامت تک پیش آنے والے مسائل کا حل' انسان کی فطرت اور دنیا کی طبیعت سے آگاہ اور باخبر خالق و مالک کی جانب سے اسلام میں' اس اعجازی شان کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے کہ اگر اسے تھوڑا سا ٹٹولئے تو ضرورت اور حالات کے اعتبار سے مناسب اور مطلوبہ چیز عصری پیرہن میں سامنے آجائے۔ بس اس کیلئے فکر' توجہ اور انفرادی اور اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے' ادھر اس ضرورت کی تکمیل کی گئی اور ادھر قانون فطرت یہ سامنے آیا کہ جس نے کوئی جستجو کی اس نے مقصد پالیا تغیر پذیر دنیا میں نئی اور بدلی ہوئی سطح پر رہبری اور رہنمائی کی یہی وہ خوبی ہے جو اسلام کو ابدیت اور ہمہ گیریت عطا کرتی ہے' پھر یہی ابدیت اور ہمہ گیریت بارگاہِ الٰہی سے اس اعلانِ عام کا باعث بنی ہے کہ " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ " (یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ آل عمران۔۱۹) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ "(اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا' سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔ آل عمران ۸۵) اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ (آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بہ طور دین کے پسند کر لیا۔ المائدہ۔ ۳)۔

اسلام کے دوامی دین کے بن جانے کے بعد خدائے لایزال کی جانب سے اہل علم و تحقیق اور اصحاب اجتہاد و استنباط کو یہ توفیق ملتی رہی ہے کہ وہ نئے زمانے کے نئے مسائل کے حل کی طرف متوجہ ہوں۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی پیش آمدہ مسائل کے شرعی اور فقہی حل کی تلاش و جستجو جاری ہے' وہ دراصل اسی خدائی منشاء اور غیبی اور قدرتی نظام کی تکمیل کا حصہ ہے۔ ایسے اہل فکر و نظر کے طبقہ سے نہ پہلے کوئی زمانہ خالی رہا ہے

اور نہ آئندہ خالی رہے گا۔ غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی۔

دین اسلام کی اس حیثیت اور اس کی مزاجی کیفیت کو سمجھنے کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ایک رسالہ کا درج ذیل بلیغ اور طاقتور اقتباس بھی نہایت مفید ہوگا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے' اور یہ امت آخری اور عالمگیر امت ہے' اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس کا واسطہ رہے گا اور ایسی کشمکش سے اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی' اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پراز تغیرات اور پراز انقلابات ہے' اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے اور زمان و مکان کی تبدیلیوں سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کیلئے دو انتظامات فرمائے ہیں'

ایک تو یہ کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں' جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا باسانی مقابلہ کر سکتی ہیں' اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے

دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت تک کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو' ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے' اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے' اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا' اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے' دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی' یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ انتظام خداوندی ہے کہ ہر دور میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور "زہر" کو جس "تریاق" کی حاجت تھی وہ اس امت کو عطا ہوا" (اجتماعی اجتہاد صفحہ ۸)

ہندوستان میں "اسلامک فقہ اکیڈیمی" کے نام سے جو ادارہ قائم ہے' وہ اسی تناظر میں ہے۔ اکیڈیمی نے اغراض و مقاصد کا جو وسیع خاکہ بنایا ہے' اس میں بنیادی طور پر یہ بات کہی گئی ہے :

"جدید عہد میں پیدا ہونے والے مسائل یا وہ قدیم مسائل جو بدلتے ہوئے حالات میں بحث و تحقیق کے متقاضی ہیں' فقہ کے اصول کی روشنی میں اجتماعی تحقیق کے ذریعہ ان کا حل تلاش کرنا ہے"۔

آج سے گیارہ سال پہلے (۱۹۸۹ء) اکیڈمی نے اپنے لئے جو یہ راہ متعین کی تھی' وہ اس کی طرف رواں دواں ہے' اکیڈمی کے تعارفی لٹریچر سے واضح ہے کہ اس کے زیر اہتمام اب تک گیارہ سمینار منعقد ہو چکے ہیں۔

۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۹ء کے درمیان جو گیارہ سمینار منعقد ہوئے ہیں' ان میں ۴۳ موضوعات پر غور و خوض کر کے فیصلے کئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیلات اس طرح ہے:

○ طبی مسائل ۴ معاشرتی مسائل ○ ۴ معاشی و تجارتی مسائل ۱۴ ○ اصولی مسائل ۳ ○ عبادات سے متعلق مسائل ۸ ○ اتحاد امت سے متعلق مسئلہ ۱۔

گذشتہ گیارہ سمینار میں جو مقالات پیش کئے گئے ہیں' ان کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز ہے۔ عالم اسلام کے ممتاز علماء و فقہاء ۲۴ کی تعداد میں شریک ہوئے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں اور اداروں سے جن اہل علم و تحقیق اور اصحاب فقہ و فتاوی نے شرکت کی ہے' انکی مجموعی تعداد کم و بیش ساڑھے پانچ سو ہے۔ اکیڈمی نے اپنی مختصر زندگی میں اشاعتی کام کی ایک زبردست تاریخ بنائی ہے۔

اطمینان اور مسرت کی بات یہ ہے کہ اس کا تمام تر اشاعتی کام اعلی' معیاری اور عصری تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے' گویا کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اس کا یہ اقدام حد درجہ قابلِ قدر اور لائق تحسین ہے۔ اکیڈمی نے فقہی سمیناروں کے مباحث و مقالات اور روداد و تجاویز پر مشتمل جو ۱۴ ضخیم مجلے شائع کئے ہیں' وہ بھی ہر اعتبار سے تاریخی اور دستاویزی ہیں' ممکن نہیں کہ اکیڈمی کے اس کار نہیں بلکہ "کارنامے" کو علمی' تحقیقی اور فقہی دنیا فراموش کر دے بلاشبہ

زندگی کچھ اور شئی ہے' علم ہے کچھ اور شئی
زندگی سوز جگر ہے' علم ہے سوز دماغ

دین اسلام کی حقانیت' ابدیت اور ہمہ گیریت کے تذکرے اور اسلامک فقہ اکیڈمی اور اس کے کام کے اجمالی تعارف کے بعد آیئے' اکیڈمی کے بارہویں سمینار میں شرکت کریں' یہ سمینار ۱۱/ فروری (جمعہ) سے ۱۴/ فروری (دوشنبہ) تک یوپی کے مشرقی شہر "بستی" میں منعقد ہوا۔ بستی کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ بلاشبہ اصحاب علم و معرفت اور اہل فکر و نظر کی بستی رہی ہے۔ اس دیار میں مولانا سید جعفر علیؒ (خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) مولانا زین العابدینؒ (تلمیذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) مولانا ہدایت علیؒ مولانا عبدالوہابؒ (تلامذہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ) اور مولانا مرتضی حسینؒ (شاگرد مولانا مفتی کفایت اللہؒ) نے خصوصیت کے ساتھ جس نہج اور جس سطح سے علمی' دعوتی' اصلاحی' تدریسی اور تعلیمی کام کیا ہے' اس کے حسین نظارے اور جگمگاتے نقوش' نظر کو نور اور دل کو سرور بخشتے ہیں۔ یہاں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں رہتے بستے ہیں' جو اپنی ذہانت' تعلیمی دلچسپی' فنی لیاقت اور قوتِ کارکردگی کے اعتبار سے شہرت رکھتے ہیں' بستی ہی میں ممتاز عالم دین اور صاحب دل بزرگ مولانا محمد باقر حسین صاحب نے "دارالعلوم الاسلامیہ" کے نام سے نہایت باوقار اور اونچے انداز میں "علم کی حسین بستی" بسائی جہاں سے "هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ

يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ "(کیا علم والے اور بے علم کہیں برابر بھی ہوتے ہیں۔الزمر ۹)۔" يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْ مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوْ الْعِلْمَ دَرَجَات "(اللہ تم میں ایمان والوں کے اور ان کے جنھیں علم عطا ہوا ہے، درجے بلند کرے گا۔المجادلہ۔۱۱)" رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا "(اے میرے پروردگار بڑھادے میرے علم کو طہ۔۱۱۴)صدائے مسلسل آتی ہے۔بارہواں فقہی سمینار محترم مولانا محمد باقر حسین صاحب کی دعوت ہی پر ان کے قائم کردہ دارالعلوم (سنہ قیام ۱۹۸۰ء) میں ہوا۔

بارہویں فقہی سمینار کیلئے جن موضوعات کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ یہ ہیں :

(۱) طلاقِ سکران (نشہ کی حالت میں طلاق)،

(۲) انٹرنیٹ اور جدید آلات کا دینی ودعوتی مقاصد کے لئے استعمال،

(۳) اختلافات ائمہ کی شرعی حیثیت،

سمینار کا افتتاحی اجلاس ۱۱/ فروری جمعہ کو اور اختتامی اجلاس ۱۴/ فروری دوشنبہ کو منعقد ہوا۔اس درمیان مختلف اوقات میں ہرسہ موضوع پر مباحث آراء اور تبادلہ خیالات کا سلسلہ جاری رہا۔پہلے موضوع پر ۴۷، دوسرے موضوع پر ۳۸، اور تیسرے موضوع پر ۲۷، مقالات اکیڈمی کو وصول ہوئے تھے۔ان تمام مقالات کی تلخیص اکیڈمی کے رفقاء نے بڑی دیدہ وری اور عرق ریزی سے ۸۸ صفحات میں کردی تھی، جسے اکیڈمی نے کتابی شکل میں "تلخیص مقالات" کے نام سے شائع کردیا تھا۔سمینار کی مختلف نشستوں کی صدارت مختلف اہل علم حضرات فرماتے رہے۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنو نے کی۔تلاوت قرآن پاک اور ترانہ دارالعلوم الاسلامیہ کے بعد دارالعلوم کے بانی وسرپرست مولانا محمد باقر حسین صاحب نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، جس میں انھوں نے ضلع بستی کی علمی، دینی، ادبی اور ثقافتی تاریخ پر اختصار سے روشنی ڈالی، اور ساتھ ہی مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ضلع بستی، سنت کبیر نگر، سدھارتھ نگر اور گورکھپور وغیرہ کے مسلمانوں کی طرف سے بھی الحاج زین اللہ صاحب نے استقبال کیا۔مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو نے اپنے افتتاحی خطاب میں فرمایا کہ اللہ نے کتاب وسنت میں ایسے اصول وضوابط رکھ دئے ہیں جن سے ہر دور میں علماء اسلام حوادث ومسائل کا شرعی حکم معلوم کرتے رہیں گے۔اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی وسکریٹری جنرل اور ممتاز ومشہور فقیہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔حضرت قاضی صاحب نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں سمینار کے موضوعات پر جو کچھ فرمایا اس سے ان کی فکر مندی، باخبری اور فقہی بصیرت چھلک رہی تھی، انہوں نے نئے مسائل کے حل کے لئے جو رہنما اصول بتائے اور آج کے دور میں فقہاء اسلام اور مفتیان عظام کی بو

ذمہ داریاں ہیں، ان پر جس انداز سے روشنی ڈالی، اس کی حیثیت اس فقہی اجتماع کے لئے ایک عظیم "علمی تحفہ" کی تھی۔ سعودی عرب سے آئے ہوئے مہمان شیخ محمد الشنقیطی نے علم، علماء کی ذمہ داریوں اور نئے مسائل کے حل کی ضرورت واہمیت پر فاضلانہ تقریر کی۔ راقم الحروف نے جلسے کی کاروائی چلاتے ہوئے افتتاحی اجلاس میں جو کچھ کہا تھا، اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ "آج کل لوگوں کی طبیعتوں میں انار کی، آزادی اور اباحیت پسندی (LIBERALISM) بڑھتی جارہی ہے، اس طرح کی فقہی اجتماعات کے جہاں بہت سارے فائدے ہیں ان میں سے ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اس طرح کی سوچ اور فکر کو آگے بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے۔ کسی مسئلہ کا بروقت اور صحیح حل، انسان کو ناامیدی اور غلط رخ کی طرف جانے سے بچاسکتا ہے۔ باخبر حضرات اس سے واقف ہیں کہ فقہی مسائل میں اجتماعی غور و فکر کا سلسلہ قرونِ اولیٰ سے چلا آرہا ہے۔ فقیہ امت امام اعظم ابو حنیفہؒ (۸۰۔۱۵۰ھ) غالباً ائمہ مجتہدین میں سب سے پہلے امام ہیں، جنھوں نے "مسائل و واقعات" میں غور و فکر کرنے کے اجتماعی طریقے کو فروغ دیا، یہ راہ اب بھی کھلی ہے، جس پر باہمی ارتباط، آپسی اعتماد، شہرت و ناموری کے جذبہ سے دور، خلوص وللہیت کے ساتھ مضبوط اور بھرپور قدموں سے چلنے کی ضرورت ہے"۔

صدر اجلاس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے صدارتی خطاب میں فقہ اسلامی کو درپیش چیلنجوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "روم وایران کے اسلام کے زیر نگیں آنے کے بعد جس طرح کے تہذیبی، قانونی اور معاشرتی چیلنجس درپیش تھے، آج اسی طرح کی صورت حال سے ہم لوگ دوچار ہیں۔ اس زمانہ میں جس طرح فقہاء، ائمہ اور محدثین نے جدوجہد کرکے، قرآن وحدیث اور اصول پر غور کرکے ہر چیز کا جواب شریعت سے تلاش کیا، آج ہم انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دور جدید کے نئے مسائل کا شرعی حل تلاش کریں"۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ "ائمہ اسلام اور فقہائے کرام کے اختلافات امت کے لئے باعث رحمت ہیں، ان کو جنگ وجدال اور تضلیل وتفسیق (ایک دوسرے کو گمراہ اور فاسق قرار دینا) کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے"۔ مولانا کی یہ تقریر تاریخی اور سماجی حالات پر تبصرہ کو اپنے اندر لئے جدید فقہی مسائل کے حل کے سلسلہ میں نہایت بصیرت افروز اور اہمیت کی حامل تھی۔

سمینار میں جن تین موضوعات پر غور وخوض کے بعد تجاویز مرتب کی گئی ہیں، ان کا حاصل اور خلاصہ ایک ترتیب کے ساتھ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

☆ **طلاق سکران** (حالت نشہ کی طلاق):

"طلاق سکران یعنی حالت نشہ کی طلاق کے سلسلہ میں درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں، اس تجویز کے پانچ دفعات پر تمام شرکاء کا اتفاق رہا، اور چھٹے شق میں اختلاف رہا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

۱۔ اگر کسی شخص نے لاعلمی میں نشہ آور حرام چیز کا استعمال کیا اور اسے نشہ طاری ہو گیا' اسی حالت نشہ میں اس نے بیوی کو طلاق دی تو یہ طلاق واقع نہ ہو گی۔

۲۔ کسی شخص نے اگر کسی نشہ آور حرام چیز کا استعمال ایسی صورت میں بہ طور دوا کے کیا جب کہ ماہر مسلم اطباء کی رائے میں اس کے مرض کا علاج اسی نشہ آور چیز سے ہی ہو سکتا ہے۔ یا بھوک اور پیاس کی غیر معمولی شدت میں (کوئی حلال چیز فراہم نہ ہونے کی وجہ سے) جان بچانے کے لئے نشہ آور چیز کا استعمال کیا اور اسے نشہ طاری ہو گیا۔ حالت نشہ میں اس شخص نے بیوی کو طلاق دے دی تو یہ طلاق واقع نہ ہو گی۔

۳۔ کسی شخص کو شراب یا کسی دوسری نشہ آور چیز کے استعمال پر مجبور کیا گیا۔ جبر واکراہ کی وہ صورت اختیار کی گئی جس میں اس کے لئے اس حرام چیز کا استعمال کرنا جائز ہو گیا' اس لئے اس نے نشہ آور چیز کا استعمال کیا اور نشہ طاری ہونے پر بیوی کو طلاق دی تو یہ طلاق بھی واقع نہ ہو گی۔

۴۔ جائز و حلال چیز کے استعمال سے اگر کسی شخص کو نشہ طاری ہو گیا اور حالت نشہ میں اس نے بیوی کو طلاق دے دی تو یہ طلاق شرعاً معتبر نہ ہو گی۔

۵۔ کسی شخص نے شراب یا کسی اور نشہ آور حرام چیز کا استعمال اپنی رضامندی سے جان بوجھ کر کیا اور اسے نشہ طاری ہو گیا لیکن وہ نشہ کی ابتدائی حالت میں ہے۔ جس میں ایک قسم کا سرور طاری ہوتا ہے' البتہ ہوش وحواس برقرار رہتے ہیں اور انسان بات سمجھتا ہے' اسی حالت میں وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو اس کی طلاق واقع ہو گی۔

۶۔ اور اگر اس حالت میں اس کو شدید نشہ طاری ہو گیا۔

جس کی وجہ سے ہوش وحواس برقرار نہ رہا' بالکلیہ ہوش وحواس کھو بیٹھا اور اس حالت میں اس نے الفاظ طلاق استعمال کیے تو اس کی طلاق واقع ہوئی یا نہیں' اس سلسلہ میں شرکاء سمینار کی دو رائیں سامنے آئیں۔ ۲۰ حضرات نے طلاق واقع ہونے کی رائے دی' جن میں مولانا برہان الدین سنبھلی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو) شامل ہیں' اور ۲۴ حضرات نے طلاق واقع نہیں ہونے کی رائے دی' جن میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی' مولانا سید نظام الدین (امیر شریعت بہار واڑیسہ) مولانا سید سلمان حسینی ندوی اور مولانا خلیل الرحمن سجاد ندوی کے اسماء گرامی بھی ہیں۔ راقم الحروف کی بھی یہی ہے۔

☆ انٹرنیٹ اور جدید ذرائع ابلاغ :

سمینار کا دوسرا موضوع "انٹرنیٹ اور جدید آلات کا دینی ودعوتی مقاصد کے لئے استعمال" تھا۔ اس سلسلہ میں درج ذیل فیصلے کیے گئے۔

۱۔ اسلام کی نشرواشاعت اور اس کی حفاظت وبقاء کیلئے ممکن جدوجہد وسعی امت مسلمہ کا اہم فریضہ ہے۔

۲۔ واعدو الهم مااستطعتم من قوۃ کے مطابق اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے جدید وقدیم ہر ممکن جائز ذریعہ ووسیلہ کا استعمال کرنا درست ہے' بلکہ ضرورت وحالات کے مطابق مفید وموثر وسیلہ کا استعمال کرنا ضروری ہے۔

۳۔ ابلاغ وترسیل کے جدید ذرائع میں ریڈیو کا استعمال دینی مقاصد کے لئے کوئی قباحت نہیں رکھتا' خواہ یہ استعمال اس کے پروگرام سے استفادہ کی صورت میں ہو' یا پروگرام میں عملاً شرکت کرکے ہو' یا یہ کہ خود اپنا ریڈیو اسٹیشن قائم کرکے۔

۴۔ بنیادی طور پر انٹرنیٹ آج کے زمانے کا سب سے اہم ذریعہ ابلاغ ہے' اس کی حیثیت اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لئے ایک ذریعہ اور وسیلہ کی ہے اور ذرائع کا حکم شرعی متعین کرتے وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ ان ذرائع کا استعمال کن مقاصد کے لئے ہو رہا ہے' ذرائع ووسائل کا استعمال جائز مقاصد کیلئے شرعاً جائز اور ناجائز مقاصد کیلئے ناجائز ہے پھر ان کا شرعی حکم اس طرح متعین ہوگا کہ ان مقاصد کا حصول فرض وواجب ہے یا مستحب ہے یا مباح ہے اور ان وسائل کا استعمال مکمل طور پر ان مقاصد کے حصول کیلئے جس حد تک ضروری ہو اسی کے بقدر ان وسائل کا استعمال فرض یا مستحب یا جائز ہوگا۔

ان اصولوں کی روشنی میں شرکاء سمینار کی رائے ہے کہ انٹرنیٹ کا استعمال ایک شرعی' دینی دعوتی' اجتماعی فلاح کے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت سے جائز اور بعض دفعہ ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عرض اور پیشکش کے طریقے میں منکرات اور محرمات شرعیہ سے بچا جائے۔

۵۔ ٹیلی ویژن ایک ایسا ذریعہ ابلاغ ہے جس کے ذریعے نہ صرف آواز بلکہ بولنے والوں کی صورتیں بھی سامعین وناظرین کے سامنے پیش ہو جاتی ہیں۔ کبھی نقل نشر مباشر (براہ راست) کے ذریعہ چلتی پھرتی صورتیں منتقل کی جاتی ہیں اور کبھی کسی مجلس، کسی عمل' کسی کھیل یا کسی تقریب کو ویڈیو کیسٹ میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور بعد میں اس کو نشر کیا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے مسئلہ میں ایک دشواری تو یہ ہے کہ اس میں جو صورتیں ناظرین تک منتقل ہوتی ہیں آیا وہ اس تصویر کشی کا محل اور مورد ہیں جن کے ممنوع ہونے کی صراحت حدیث نبویؐ میں آئی ہے یا نہیں؟ عام طور پر علماء ہند اس طرح کے عکس ریز کیمروں سے لی گئی تصویر کو بھی اس تصویر کشی کا حصہ مانتے ہیں۔ ممالک عربیہ کے بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ فوٹوگرافی ممنوع تصویر سازی کا محل نہیں۔

ٹیلی ویژن کے ساتھ دوسری دشواری اس کے استعمال کی ہے (انٹرٹینمنٹ) تفریحات' تجارتی اشتہارات کے ذریعہ عورتوں کی عیاں تصویروں کی اشاعت' بے حیائی فحاشی کو عام کرنا' ایسی نخش فلموں کا

نشر کیا جانا' جس کو باپ بیٹا' ماں بیٹی ایک ساتھ دیکھ نہیں سکتے' پھر بچوں کو اس طرح اپنے سحر میں گرفتار کرلینا کہ ان کی تعلیمی دلچسپی ختم ہو جائے۔ یہ وہ برائیاں ہیں جن کی وجہ سے ٹیلی ویژن موجودہ سماج کے لئے ایک بڑا ناسور بن گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ٹیلی ویژن کے ذریعہ کچھ مفید کام لئے جاسکتے ہیں اور لئے جاتے ہیں' لیکن معاشرے کو پہنچنے والا ضرر' اس سے حاصل ہونے والے نفع سے کہیں زائد ہے " اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا" ان حالات میں شرکاء سمینار ٹیلی ویژن کے استعمال اور اسکے ذریعہ ان منکرات وفواحش کی اشاعت کو ناجائز اور معاشرے کیلئے تباہی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اس سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں۔

۶۔ایک اہم سوال ان چینل کے حکم شرعی کا ہے جو خالص دینی ودعوتی مقاصد کے لئے قائم کئے گئے ہیں اور قائم کئے جارہے ہیں اور ہر طرح کی فحاشی' عریانی سے پاک اور خالی ہیں کیا ایسے چینلس (Channels) کا قائم کرنا اوران سے استفادہ کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

تمام شرکاء سمینار نے اس کو جائز قرار دیا ہے جبکہ بعض حضرات ان حالات میں بھی عدم جواز کے قائل رہے۔ مولانا برہان الدین سنبھلی اور مولانا ارشد قاسمی فاروقی کی یہ رائے سامنے آئی کہ اگر براہ راست نشر (Live) ہو تو جائز ہوگا اور اگر محفوظ کیا ہوا پروگرام (Recorded Programme) نشر کیا جائے تو جائز نہیں ہوگا۔

☆ **اختلافات ائمہ :**

سمینار کا تیسرا اہم موضوع "اختلافات ائمہ کی شرعی حیثیت" تھا' اس ضمن میں شرکاء کے اتفاق رائے سے جو فیصلے کئے گئے' وہ یہ ہیں :

۱۔احکامِ شرعیہ کے دو حصے ہیں' منصوص اور غیر منصوص۔ منصوص سے مراد وہ احکام شرعیہ ہیں جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں اور غیر منصوص سے مراد وہ احکام ہیں جن کا تعلق ائمہ مجتہدین اور فقہائے امت کے اجتہاد واستنباط سے ہے بلاشبہ ائمہ وفقہاء کے اجتہادات اور ان کا فقہی ذخیرہ ہمارا قیمتی سرمایہ اور شریعت اسلامیہ کا حصہ ہیں۔

۲۔ائمہ مجتہدین کے درمیان مسائل میں جو اختلاف رائے ہے' وہ اختلاف حق وباطل نہیں ہے بلکہ مختلف فیہ مسائل کی ایک بڑی تعداد وہ ہے جن میں افضل' غیر افضل' راجح' غیر راجح کا اختلاف ہے' باقی مسائل میں اختلاف کی نوعیت یہ ہے کہ ایک رائے صواب باحتمال خطا اور دوسری رائے خطا باحتمال صواب پر محمول ہے۔

۳۔ عامی جو کتاب و سنت اور دلائل شرعیہ سے واقف نہیں ہے' اس کے لئے راہِ عمل یہ ہے کہ وہ کسی معتمد و مستند عالم دین سے مسئلہ شرعی معلوم کر کے اسپر عمل کرے اور وہ اسی طرح شریعت پر عمل پیرا قرار دیا جائے گا۔

۴۔ ائمہ مجتہدین کی آراء پر عمل کرنے والی مختلف جماعتوں یا افراد کا ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا یا اکابر سلف کی مذمت کرنا یا ان کے فقہی استنباط کو تمسخر (ہنسی مذاق) کا نشانہ بنانا قطعاً حرام ہے اور یہ کسی مسلمان کے لئے دنیا و آخرت میں سخت بد نصیبی اور خسارہ کا سبب ہے۔

۵۔ اختلافی مسائل میں سلف صالحین کی روش' رواداری' ادب و احترام' ایک دوسرے کے مقام و منصب کو ملحوظ رکھنے اور ان کے علوم و معارف کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے کی رہی ہے' ان حضرات نے علمی مباحث میں ان آداب کی پوری رعایت کی ہے' بلاشبہ سلف صالحین کی روش ہمارے لئے مشعل راہ ہے' افراد امت کی ذمہ داری ہے کہ اسی روش کو اختیار کریں اور اختلافی مسائل میں راہ اعتدال پر چلیں۔

۶۔ اگر وقت اور حالات کی تبدیلی سے معاشرہ کسی مشکل صورتِ حال کا شکار ہو اور ائمہ مجتہدین کی فقہی آراء میں سے ایک پر عمل حرج اور دشواری کا باعث ہو اور دوسری فقہی رائے پر عمل سے یہ حرج دور ہو جائے تو ایسی صورت میں علماء فقہاء جو اصحاب ورع و تقوی اور ارباب علم و فہم ہوں ان کیلئے دوسری رائے پر فتوی دینا جائز ہے' جو باعث دفع حرج ہو' البتہ اس طرح کے مسائل میں انفرادی طور پر فتوی دینے کے بجائے اجتماعی طریقہ اختیار کیا جائے۔

۷۔ ایسے مسائل جن میں مستند علماء و فقہاء کی ایک جماعت عدول کی ضرورت سمجھے اور مسئلہ مجتہد فیہ میں ایک خاص فقہی رائے کو دفع حرج کے لئے اختیار کرے اور اس پر فتوی دے اور دوسری جماعت اس سے اختلاف کرے اور اس فقہی رائے کو اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے ایسی صورت میں عام لوگوں کے لئے اس رائے پر عمل کرنا جائز ہے جس میں عدول کر کے سہولت کی راہ اختیار کی گئی ہے اور اصحاب افتاء کے لئے اس رائے پر بھی فتوی دینا جائز ہے۔" (تجاویز کا حصہ ختم)

اسلامک فقہ اکیڈمی کے بارہویں فقہی سمینار میں بھی اس کے پہلے سمیناروں کی طرح مختلف اداروں' جماعتوں اور مسلکوں سے وابستہ ممتاز علماء فقہاء اور اہلِ افتاء قابلِ لحاظ تعداد میں شریک رہے۔

بیرونی شرکاء میں شیخ عبدالرحمن الراجی' شیخ ناصر' شیخ یحی الحیی' شیخ محمد الشنقیطی' ڈاکٹر محمد اور مولانا یعقوب اسماعیل منشی کے نام قابلِ ذکر ہیں' اندرونِ ملک کے شرکاء میں جن کے نام کا اظہار پہلے ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا مفتی عبدالرحمن' مفتی جنید عالم قاسمی' مفتی نسیم احمد قاسمی' مولانا قاضی عبدالجلیل'

مولانا احمد دیولوی، مولانا محمد افضال الحق، مفتی سعید الرحمٰن، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا محفوظ الرحمٰن شاہین جمالی، مولانا اختر امام عادل، مولانا سلطان احمد اصلاحی، ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی، مولانا شمس تبریز خاں، مولانا ابوالعاص وحیدی، مولانا ریاض احمد سلفی، مولانا شفیق الرحمٰن ندوی اور مولانا محمد زید اور دیگر علماء شریک ہوئے۔ حیدر آباد سے شریک ہونے والوں میں راقم الحروف کے علاوہ جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب، جناب سلیمان سکندر، مولانا سید اسرار الحق سبیلی اور جناب بہاء الدین شامل ہیں۔ سمینار، دارالعلوم اسلامیہ کے وسیع اور کشادہ ہال میں منعقد ہوا۔ شرکاء کی راحت رسانی کے لئے محترم مولانا محمد باقر حسین نے، مولانا اسعد قاسمی، مفتی شکیل احمد قاسمی، مولانا ظہیر انور قاسمی، مولانا نثار احمد قاسمی اور دیگر اساتذہ مدرسہ اور رفقاء کار کے ساتھ جس کشادہ قلبی اور سلیقہ شعاری کا ثبوت دیا۔ اس کی یاد تازہ رہے گی۔ مولانا امین عثمانی ندوی، مولانا فہیم اختر ندوی، مولانا شمشاد نادر قاسمی، مولانا انیس اسلم مفتاحی اور فقہ اکیڈیمی کے دوسرے ذمہ داران اور کارکنان، سمیناری ضرورتوں کی تکمیل میں سرگرم رہے۔ ان حضرات نے مہمانوں کی قدر دانی میں بھی کوئی کمی نہیں ہونے دی، اسلامک فقہ اکیڈیمی کے دو مستعد اور باشعور سکریٹریز مولانا عتیق احمد قاسمی اور مولانا عبیداللہ اسعدی اپنے کام میں حضرت قاضی صاحب مدظلہ کی ہدایات کے بموجب جٹے رہے، اکیڈیمی اور دیگر افراد اور اداروں کی طرف سے جو بعض نئی اور اہم کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ ان کی رسم اجراء بھی افتتاحی اجلاس میں انجام پائی۔ دارالعلوم اسلامیہ بستی کا سہ ماہی جریدہ ''فکر اسلامی'' کے نام سے نکلتا ہے، جس کے مدیر نوجوان فاضل مولانا محمد اسعد قاسمی ہیں۔ انہوں نے اس موقع پر اپنے رفقاء کے تعاون سے اس جریدہ کا نہایت قابل قدر خصوصی شمارہ ''معاصر فقہ اسلامی'' کے نام سے شائع کیا جس کے صفحات (۴۹۲) ہیں۔ اس علمی، تحقیقی اور دستاویزی رسالہ کو قدر کی نگاہوں سے پڑھنے کے لئے اہل علم نے شوق کے ہاتھوں لیا۔

اس علمی، تحقیقی اور فقہی سمینار کے دل کش مناظر کو اپنی نگاہوں میں بسائے جب میں ''بستی'' سے اپنی ''بستی'' کی طرف لوٹ رہا تھا، تو جناب لاہور سے ڈاکٹر محمد اقبال کی یہ آواز کان میں آنے لگی۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل ہوتی ہے نظر پیدا

☆☆☆

اسلام کا نظریۂ تعلیم و تربیت

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
(مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

انسانی معاشرے میں انسان کو بلند مقام دینے اور عزت و سربلندی کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچانے میں نظامِ تعلیم و تربیت کا اولین کردار رہا ہے۔ یہ تعلیمی نظام اپنی مختلف صورتوں اور شکلوں اور اجتماعی و تمدنی طریقوں کے ساتھ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمیشہ جلوہ گر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ علم کی اہمیت اور اس کے مقامِ بلند سے پوری طرح واقف ہیں وہ ہمہ وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کے معاشرے اور خاندان کے افراد شرابِ علم کی لذت سے آشنا اور تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں اور اخلاق و اجتماعی تعلیمات سے بھرپور طریقے پر مستفید اور بہرہ ور ہوں، تاکہ اپنے ماحول میں، انسانی معاشرے میں اور آگے بڑھ کر عالمی پیمانے پر تمدنی و ثقافتی حلقوں میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ان کے لیے ممکن اور آسان ہو جائے۔

یہ تعلیمی اور تربیتی شعور و ادراک ایک بشری خاصہ، ابن آدم کی مایۂ خمیر اور لازمہ زندگی ہے، جو ہر انسان کے ساتھ وابستہ رہتا ہے اور اس کو علم دوستی، علماء پروری اور ان مردانِ کار سے محبت و الفت پر ابھارتا رہتا ہے، جنہوں نے اس میدان میں اپنے ذہن و دماغ کی بلند پروازیاں اور فکر و تخیل کی جولانیاں دکھائیں، علم و فن اور تہذیب و ثقافت کے احیاء و ترقی میں اپنی کدوکاوش اور سخت کوشی و جاں فشانی کا آخری قطرہ نچوڑ کر دنیائے علم میں لافانی نقوش چھوڑے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے، قلمے، غرض ہر طرح اس میں حصہ لے کر یہ ثابت کر دیا کہ علم سے ہماری زندگی ہے اور ہماری زندگی سے علم ہے، جنہوں نے اپنی عزیز ترین متاعِ حیات کو اسی علم کے لئے وقف کر دیا اور حالات و مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی انفرادی، اجتماعی، اخلاقی، تہذیبی و ثقافتی غرض زندگی کے مختلف گوشوں میں علم کی نفع رسانی اور اثر آفرینی کا یقین دلوں میں اسی طرح سرایت کئے ہوئے ہے ع

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

عام طور سے علم کے متعلق یہ خیال پایا جاتا ہے کہ علم ہی اچھا انسانی معاشرہ اور بہترین انسانی سوسائٹی کی تشکیل کر سکتا ہے، علم ہی ہے جو دلوں کو فضائل سے آراستہ، رذائل سے پاک اور زندگی کو مکارمِ اخلاق سے مزین و شائستہ بنا کر انسانی اقدار کی حفاظت اور اس کی قیمت و وقعت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

اسلامی زندگی کا قصر بلند بھی روزِ اول سے علم ہی کی پختہ بنیادوں پر قائم ہے، اخلاق و کردار اور اسلامی سیرت و سلوک کا سرچشمہ بھی علم ہے۔ یہی علم ایک ایسا ممتاز دستورِ زندگی کو وجود میں لاتا ہے جس کے جلوے بکھرے ہوئے، جس کی برکتیں پھیلی ہوئی ہیں، اور جو چمن انسانیت کو اپنے چشمۂ شیریں کے آبِ حیات کے ذریعہ سرسبز و شاداب اور گل و گلزار بنائے رکھتا ہے۔ اس کا یہ چشمۂ حیوان نہ کبھی پایاب ہونے والا ہے، اور نہ اس کی فیض رسانی میں کبھی کمی آسکتی ہے۔

اسلام نے علم کی مختلف صورتوں اور شکلوں کو انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے، اسے زیادہ سے زیادہ جلا بخشنے اور تعمیر و ترقی کی راہ میں لگانے کا ذریعہ بتایا، جس کے ذریعے ایمان و یقین کے گہرے سائے میں ایک تہذیبی و ثقافتی جہانِ نو کی تعمیر ہو سکے۔

اسلام کی قائم کی ہوئی تہذیب و ثقافت دراصل زندگی اور معاشرے کی تمام مادی اور معنوی تقاضوں کو شامل ہے اور انسان کی نفسیاتی اور عقائدی تمام ضروریات کی متکفل اور ذمہ دار ہے۔ وہ اپنی بے پایاں نوازش اور لامحدود عطا و بخشش کے ذریعے زندگی کو بامقصد بناتا ہے، جس زندگی کا مطمح نظر انسان سازی اور دنیا کی خوش حالی و فارغ البالی کیلئے کوشش کرنا ہے۔ نیز زندگی کا اولین مقصد یہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر علاقے میں ایمان، امن و امان، اخوت و محبت اور بھائی چارگی و الفت کے جذبات کو فروغ دیا جائے اور ایسی فضا قائم کی جائے جس میں انسانی اقدار کی حکمرانی ہو، محبت و پیار کے نغمے الاپے جائیں اور انسان دوستی اور امن پسندی کے زمزمے بلند ہو رہے ہوں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام جس علم کی ستائش کرتا ہے اور جس پر معاشرے اور تہذیب و تمدن کی عمارت قائم ہوتی ہے، اس کی کچھ حدود ہیں، کچھ نقوش اور کچھ اصول ہیں اور کچھ قواعد و کلیات بھی، ساتھ ہی ساتھ وہ ایک روشن تابناک اور گہر انقطۂ نظر بھی رکھتا ہے جس کے چشمے ایمانِ خالص اور دینی عقیدے سے پھوٹتے ہیں، اس علم کے حاملین بھی اسی صاف شفاف چشمے سے سیراب ہو کر علم کے آبدار جواہرات اور لؤلؤ و مرجان دنیا کے سامنے بکھیرتے ہیں اور اسی کی روشنی میں اپنے ان اصول و ضوابط کو وضع کرتے ہیں جو علم و فن اور تہذیب و ثقافت کی نشر و اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں، جن کے ذریعے علمی و تربیتی پروگرام میں جن وسائل و ذرائع کا ہونا

ازبس ضروری ہے اس کا پتہ چل سکے' نیز ان کے یہ اصول وضوابط ان کی سب سے بڑی ذمہ داری امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور ایمان باللہ کی ادائیگی میں ان کو فائدہ اور سہولت پہنچا سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنے خاص نظامِ تعلیم وتربیت کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز اور فائق رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس نظام کو بروئے کار لانے اور اسے عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے مختلف اسلامی درس گاہیں' جامعات' یونیورسٹیاں اور تہذیبی وثقافتی مراکز قائم کئے جن کو حالات وکوائف کے مطابق پوری آزادی کے ساتھ وہ جملہ ممکن الحصول وسائل کے ذریعے چلاتے رہے ہیں' اس کے انتظام وانصرام میں کسی قسم کی پابندی اور دباؤ کسی دوسری جانب سے ان پر قطعاً نہ تھا اور نہ کسی طبقے کی طرف سے ایسے الزامات ان پر عائد تھے جو ان کے نظامِ تعلیم کی طبیعت کے منافی اور ہم آہنگی کی روح کو نقصان پہنچاتے ہوں' کیوں کہ یہی وہ روح ہے جو ہر نظامِ تعلیم کی خصوصیت اور مابہ الامتیاز وصف ہے اور جو اس کے پورے جسم میں ہر وقت گردش کرتی رہتی ہے۔

اسلامی تعلیمات' انسانی علوم وفنون اور آفاقی وکائناتی اسرار ومقاصد کی گرہ کشائی اور جدید سے جدید اکتشافات کے سلسلے میں کسی قسم کی حد بندی کی قطعاً قائل نہیں ہیں' بلکہ ان علوم کے سمندر بے کنار میں غواصی کرنے اور قیمتی سے قیمتی گوہر تابدار نکال کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور اس راہ کی دشواریوں سے نبرد آزما ہونے میں اپنے متبعین کی پوری مدد کرتی ہیں' وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلامی زندگی کے عروج وکمال کے لئے انسانی اور دینی دونوں قسم کے علوم کی یکساں ضرورت ہے۔ اسلامی زندگی اپنی افادیت اسی وقت ثابت کر سکتی ہے جب وہ ان علوم کے درمیان صحیح توازن قائم رکھے اور کائناتی وآفاقی دلائل قدرت اور اسرار ورموز کی نقاب کشائی کے لیے ہمہ وقت کوشاں اور سرگرداں رہے۔

☆☆☆

محمد رضوان القاسمی

نظامِ اخلاق میں

الفاظ کے صحیح استعمال کی اہمیت

تاریخ مذاہب پر جن لوگوں کی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ مذاہب کی تاریخ میں پانچویں صدی قبلِ مسیح خاص اہمیت کی حامل ہے، یہی وہ زمانہ ہے جس میں ہندوستان میں جین مت اور بدھ مت کے افکار، فلسطین میں یوسیاہ کی تعلیمات، ایران میں زردشت کے عقائد اور چین میں لادزد اور حکیم کنفیوشس (Confueius..) کے نظریات کارفرما ہے ہیں۔ اس وقت آخر الذکر (کنفیوشس) کا تذکرہ مقصود ہے۔ یہ اپنے دور (۵۵۱۔۴۷۹ ق م) میں ایک عظیم فلسفی اور دانشور کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ ریاست شان نونگ کے ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے بڑا ذہین تھا۔ بیس سال کی عمر تک چینی رسم ورواج، رہن سہن کے طریقوں اور اصولوں کا مطالعہ کیا۔ چوبیس سال کی عمر میں ریاست سونگ کا وزیر قانون اور پھر وزیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ اس نے اپنے اخلاقی درسوں سے رعایا کے کردار وعمل میں بہتری پیدا کی۔ بعد میں ریاست کا راجا اور اس کے اور اس کے لڑکے، کنفیوشس کی صاف گوئی اور انصاف پسندی سے خائف ہوگئے اور اسے ریاست سے باہر نکال دیا گیا۔ بیس سال تک کنفیوشس نے چین کی مختلف ریاستوں کی سیاحت کی اور لوگوں کو اپنے اخلاقی نظریات کا درس دیا۔ اس نے اپنی زندگی میں ایسے اصولوں پر زور دیا جو میانہ روی کے علمبردار ہیں۔ وہ بذات خود بھی ان پر عمل پیرا رہا۔ چونکہ وہ ایک سرکاری عہدیدار کا لڑکا تھا اور خود بھی برسوں سرکاری ملازمت سے وابستہ رہ چکا تھا، اس لئے اس کی تعلیم کا زیادہ تر تعلق عملی زندگی سے ہے، جس میں سچائی، پاکیزگی اور دیانت داری کو زیادہ دخل ہے۔ کنفیوشس کا نقطۂ نظر تھا کہ انسان کائنات کا مرکز ہے اور اس کی ذات میں اعلیٰ کردار کے جوہر پوشیدہ ہیں۔ اگر وہ دھیان دے تو اپنے ان جوہروں کو دریافت کرسکتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو شاعری، ادب، تاریخ اور روایات کا درس بھی دیتا تھا اور انہیں یہ بھی بتاتا تھا کہ نظامِ اخلاق میں الفاظ کے صحیح استعمال کی کتنی اہمیت اور اس کا کتنا اونچا مقام اور مرتبہ ہے۔

سب سے پہلا کام

اس سلسلہ میں اس کا ایک واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ”ایک دفعہ اس کے ایک شاگرد زالو نے اس سے کہا کہ

فرض کیجئے، ایک ریاست کا والی آپ کو دعوت دیتا ہے کہ آپ اس کے نظامِ حکومت کو چلانے میں اس کی مدد کریں۔ آپ اس وقت سب سے پہلے کیا قدم اٹھائیں گے؟ کنفیوشس نے جواب دیا، سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ الفاظ کا صحیح استعمال شروع کیا جائے، زالو نے مذاق سمجھا اور پھر سوال کیا۔ اس پر کنفیوشس کو غصہ آگیا اور اس نے ترش لہجہ سے کہا تم کتنے بد اخلاق ہو، اگر الفاظ صحیح نہ ہوں تو زبان واقعات کی تابع نہیں ہو سکتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کے تمام معاملات درہم برہم ہو جائیں گے۔ اخلاق ناپید ہوگا، نفاق بڑھ جائے گا، انصاف دنیا سے مٹ جائے گا، معصوم لوگ سزا پائیں گے اور گناہگار اور مجرم آزادی سے لوگوں کو اپنے ظلم کا تختۂ مشق بنائیں گے، اس لئے ایک مصلح کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ صحیح الفاظ کا استعمال کرے۔
(مبادیات تحقیق از عبد الرزاق قریشی صفحہ ۵۹-۵۸)

ایک فاضِل کا فریضہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکیم کنفیوشس کی مذکورہ بات میں بڑی حکمت ہے۔ ایک عالم، فاضل، محقق، دانشور، باخبر اور باادب آدمی کیلئے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کا صحیح استعمال کرے، معنی و مفہوم اور مراد و مطلب کو الفاظ کا جو جامہ پہنائے وہ موزوں اور چست ہو، الفاظ سے اندر کی حقیقت چھلک رہی ہو، اور زبان واقعات کی تابع ہو، اس سے اخلاقی نظام کی درستی اور بہتری میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ آج کی دنیا میں جو فتنہ و فساد، عداوت و نفاق اور ظاہر و باطن میں دو عملی اور تضاد کا سکہ ہر طرف چلتا نظر آتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ نیت کا کھوٹ اور الفاظ کی ملمع سازی ہے، بقول شاعر۔

یوں تو الفاظ ہیں اظہارِ مطالب کیلئے
لوگ الفاظ میں نیت کو چھپا دیتے ہیں

اصحابِ دل اور قلندروں کے اس طریق سے بہت کم لوگ آشنا ہیں، جس کے بارے میں علامہ اقبال کا فرمان ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

الفاظ کا استعمال، موزونیت اور دل و زبان کی رفاقت کی ضرورت

موقع خوف و ہراس کا ہو یا شوق و رغبت کا، دونوں میں ایک شریف انسان کو چاہئے کہ الفاظ کے استعمال میں اس کی موزونیت اور دل و زبان کی رفاقت کا خاص خیال رکھے اور الفاظ کے پردے میں اپنی نیت کے فساد اور کھوٹ کو وہ چھپانہ دے، اس سلسلہ میں ایک اہم ہدایت قرآن حکیم کی سورہ بقرہ آیت (۱۰۴) میں ملتی ہے،

جس کا حاصل یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مجمع میں قرآنِ مجید سناتے یا تبلیغ کرتے ہوتے اور لوگ کوئی بات سن نہ پاتے تو قدرۃً دوبارہ آپؐ کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتے یہود نے ایسے موقع کے لیے ازراہِ شرارت لفظ "راعنا" استعمال کرنا شروع کیا تھا، اس کے اصل معنی عربی کے لحاظ سے تو صرف اس قدر ہیں کہ "ہماری مصلحت کی رعایت فرمایئے اور دوبارہ ارشاد فرمایئے" لیکن راعنا کے "ع" کو ذرا کھینچ کر پڑھا جائے تو اس سے عبرانی زبان میں جو مفہوم پیدا ہوتا ہے وہ بددعائیہ اور گستاخانہ ہے یہود ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مسلمان ان کی اس شرارت سے غافل، بے خبر اور خالی الذہن تھے۔ وہ خود بھی بعض اوقات یہ لفظ بولنے لگتے، اس سے ان شریروں کو اور گنجائش ملی، آپس میں بیٹھ کر ہنستے تھے کہ اَب تک تو ہم ان کو خفیہ ہی بُرا کہتے تھے، اَب علانیہ کہنے کی تدبیر ایسی ہاتھ آگئی کہ مسلمان بھی اس میں شریک ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس گنجائش کو ختم کرنے کیلیے مسلمانوں کو حکم دیا کہ "اے ایمان والو تم لفظ "راعنا" مت کہا کرو اور اس کی جگہ "اُنظرنا" (ہمارے اوپر نظر کیجیے) کہہ دیا کرو۔ "کیوں کہ اس لفظ کے معنی اور "راعنا" کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں۔ راعنا کہنے میں یہودیوں کی شرارت چلتی ہے اس لیے اس کو ترک کر کے دوسرا لفظ استعمال کرو" اس حکم کا خصوصی پہلو تو یہ ہے کہ مرتبۂ رسالت کا ادب صرف معنوی ہی حیثیت سے نہیں، لفظی حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے آپؐ کی شان میں احتمال بھی اہانت کا نکلتا ہے وہ ممنوع ہیں اور ان سے احتیاط لازم ہے، بلکہ امام مالکؒ کے یہاں تو ایسے الفاظ پر حد واجب ہوتی ہے۔ جہاں تک حکم کا عمومی پہلو ہے تو اس سے ثابت ہے کہ سماجی زندگی میں ایک انسان کو الفاظ کے استعمال میں اخلاقی اقدار کا پابند ہونا چاہیے۔ ایسے الفاظ جو فتنہ انگیز، اہانت آمیز، کردار شکن، غیر حقیقت پسندانہ اور مشتبہ ہوں، ان کے استعمال سے احتراز کیا جائے، بصورتِ دیگر ادب و شرافت کی دنیا میں اسے قابلِ مؤاخذہ عمل قرار دیا جاسکتا ہے۔

سیرت طیبہ سے دو نمونے

قرآنِ حکیم کی مذکورہ آیت کے علاوہ احادیث میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر کسی کو کوئی ایسا لفظ استعمال کرتے سنا جو غیر موزوں، غیر حقیقت پسندانہ اور حال اور واقعہ کے مطابق نہیں ہے تو آپؐ نے اسے ٹوکا اور تصحیح فرمائی نمونہ کے طور پر دو واقعات پیش ہیں:

حدیث کی مشہور کتاب ابوداؤد (کتاب الادب باب فی الاستیذان) میں ہے کہ آپؐ گھر میں تشریف فرما تھے، قبیلۂ بنو عامر کے ایک آدمی آپؐ سے ملنے کے لئے آئے۔ آتے ہی بغیر سلام کے انہوں نے کہا

"أ ألِجُ" کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ آپؐ نے آواز سن کر اپنے خادم کو بلایا اور فرمایا کہ یہ شخص اندر آنے اور اجازت طلب کرنیکے آداب سے نا آشنا ہے۔ اس سے جا کر کہو کہ وہ پہلے سلام کرے پھر کہے "أأدخُلُ" کیا میں داخل ہو سکتا ہوں (یا اندر آسکتا ہوں) آنیوالے صاحب نے آپؐ کی ہدایت باہر سن لی اور فوراً انہوں نے سلام کیا اور "أأدخُل" کے لفظ سے اجازت طلب کی۔ آپؐ نے اجازت مرحمت فرمادی اور وہ اندر آگئے۔ اس میں قابل توجہ جو پہلو ہے وہ یہ ہے کہ "أألِجُ" کے لفظ کو بدل کر "أأدخُل" کا لفظ استعمال کرنے کیلئے فرمایا جو مناسبِ حال تھا۔ حالانکہ دونوں لفظ کے معنی داخل ہونیکے ہیں مگر اول الذکر (أألِجُ) کا استعمال تنگ جگہ میں داخل ہونے کیلئے ہوتا ہے، نیز جس کیلئے یہ لفظ استعمال کیا جارہا ہو، اس میں اس کیلئے اعزاز واکرام کا پہلو نہیں نکلتا ہے۔ جب کہ ثانی الذکر (أأدخُل) کا استعمال گھر اور کشادہ جگہ میں داخل ہونے کیلئے ہوتا ہے اور اس میں لفظی اعتبار سے وقار اور اعزاز واکرام کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ گویا آپ کی نظر جہاں لوگوں کے اخلاق و کردار کو بنانے اور سنوارنے پر تھی۔ اس کے ساتھ الفاظ کے غلط اور صحیح استعمال پر بھی تھی کہ کون کس وقت، کیا لفظ استعمال کر رہا ہے اور پھر ایک "مصلح" اور "مصحح" کی حیثیت سے بروقت اصلاح اور تصحیح فرمادیا کرتے تھے، یہی حال آپؐ کا ناموں کے بارے میں بھی تھا کہ اگر کسی کا نام معنی کے اعتبار سے ناموزوں اور نامناسب ہوتا تو آپؐ اسے فوراً بدل دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں متعدد واقعات، حدیث اور سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں، جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔

دوسرا واقعہ "عشاء" کو "عتمہ" کہنے کی ممانعت سے متعلق ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قدیم زمانہ سے عرب کا دستور تھا کہ دیہاتی رات میں شفق ڈوبنے کے بعد اپنی اونٹنیوں کا دودھ دوہنا شروع کرتے تھے اور پھر کافی دیر تک اس میں مصروف رہا کرتے تھے حتی کہ رات بالکل تاریک ہو جاتی تھی۔ اسی اعتبار سے انہوں نے اس خاص وقت کا نام "عتمہ" (تاریکی) رکھ لیا تھا۔ جب اسلام کی روشنی نے سرزمینِ عرب کو منور کیا اور اس کے ساتھ پانچوں وقت کی نمازیں (مخصوص ناموں کے ساتھ) شروع ہوئیں تو دیہاتوں اور بیابانوں میں رہنے والے مسلمان (اعراب یعنی دیہاتی) نہ صرف یہ کہ شفق چھپنے کے بعد کے وقت کے اپنے قدیم نام "عتمہ" کے اعتبار سے عشاء کی نماز کو "عتمہ کی نماز" کہنے لگے بلکہ اونٹنیوں کو دوہنے میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس نماز میں بہت تاخیر بھی کردیا کرتے تھے، پہلے اونٹنیوں کا دودھ نکالتے اور جتنا بھی وقت اس میں لگتا، لگاتے اور پھر نماز پڑھنے کے لئے آتے۔ خرابی اس میں یہ تھی کہ عشاء کی نماز کو "عتمہ کی نماز" کہنے سے زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے ساتھ مشابہت لازم آتی تھی، لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "عشاء کی نماز" کے لئے اس نام کو ناپسند فرمایا اور اس سے منع فرمایا اور اپنے اس امتناعی حکم سے بعد میں آنے

والے مسلمانوں کو بتادیا کہ ان کو اپنی زبان اور اپنی بول چال کو شرعی مصطلحات کے مطابق درست کرنا چاہئے اور جو مصطلحات و محاورات خالص دوسرے لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوں اور صرف ان کی بول چال میں استعمال کی جاتی ہوں ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ہر لفظ اپنا خاص مزاج اور پس منظر رکھتا ہے، اس کے استعمال میں دانا کو دانائی سے کام لینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں خلط ملط کرنا یا بے احتیاطی اور بی اعتنائی سے کام لینا، گویا الفاظ کی روح کو متاثر کرنا اور ان کی "حیثیتِ عرفی" کو مجروح کرنا ہے۔

الفاظ کے استعمال میں آدمی کی حیثیت اور مرتبہ کا لحاظ

اسی طرح اگر کسی عبارت کا تعلق آپس میں دو آدمیوں سے ہو تو اس سلسلہ میں جو الفاظ منتخب کئے جائیں اس میں دونوں کی حیثیت اور مرتبہ کا لحاظ اور خیال رکھنا چاہئے۔ بسا اوقات الفاظ کی ترکیب سے جو جملے بنتے ہیں وہ صحیح اور درست ہوتے ہیں مگر بات چیت کے وقت متکلم کا جو انداز اور تیور ہوتا ہے وہ مناسب حال نہیں ہوتا، دونوں صورتوں کی ایک ایک مثال لیجئے۔

ہندوستانی علماء میں محدث جلیل علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا بڑا اونچا مقام ہے، علامہ اقبالؔ بھی ان کے علم و فضل کے معترف و مداح تھے۔ "اقبال کے ممدوح علماء" نامی کتاب میں اس کا ذکر بھی ہے، علامہ کشمیریؒ ایک دفعہ حیدرآباد کے مشہور ایڈوکیٹ جناب فیض الدین مرحوم کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لائے، مقصود یہ تھا کہ علامہ سے وہ بخاری شریف کی تعلیم کا آغاز کریں۔ اب تک وہ معروف عالم مولانا ادریس کاندھلویؒ سے عربی کی قابلِ لحاظ کتابیں پڑھ چکے تھے، علامہ کشمیریؒ کی حیدرآباد تشریف آوری میں مولانا کاندھلویؒ کی بھی خواہش کا دخل تھا۔ جب وہ تشریف لائے تو یہاں کے قیام میں بقول مصنف "نقشِ دوام" (مولانا انظر شاہ کشمیری) "علامہ کی خسروئے دکن سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں دیوبند سے "مہاجر" کے نام سے ایک اخبار نکلتا تھا اس اخبار میں نظام حیدرآباد اور علامہ کی ملاقات کی خبر اس جلی سُرخی کے ساتھ شائع کی جارہی تھی کہ "بارگاہِ خسروی میں علامۂ جلیل مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی باریابی"۔ اخبار چھپا نہیں تھا کہ کسی طرح آپ کو اس عنوان کی اطلاع ہوگئی۔ اخبار کے منتظمین کو بلا کر ارشاد فرمایا کہ "ہر چند کہ میں ایک فقیر بے نوا ہوں مگر اتنا گیا گذرا ہوا بھی نہیں کہ اس طرح کے عنوانات پسند کروں۔ آپ صرف اتنا لکھئے۔ "نظام حیدرآباد سے انور شاہ کی ملاقات"۔ (نقشِ دوام صفحہ ۸۹،۸۸) گویا سلطان دکن کی دین دوستی اور علم پروری اپنی جگہ بجا مگر علامہ کی جو دینی و علمی شہرت اور محدثانہ عظمت تھی، اس کے پیشِ نظر "بارگاہِ خسروی" اور "باریابی" کے الفاظ کو پسند نہیں فرمایا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خوددار اور غیرت مند علماء نے اپنی جبینِ علمی کو ہمیشہ بلند رکھا ہے اور کبھی بھی ایسے الفاظ کو پسند نہیں فرمایا جو علم، دین اور وقار و اعتبار کیلئے ننگ و عار کا باعث ہوں۔

صحیح الفاظ کے ساتھ صحیح انداز کی اہمیت

صحیح الفاظ کے ساتھ صحیح انداز کی جو اہمیت ہے، اس کا اندازہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے بیان کردہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ "حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جب حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے پاس پہونچے تو ایک روز حضرت گنج شکرؒ نے ان سے کہا کہ "آؤ! آج تم کو "عوارف المعارف" پڑھائیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اس کتاب کو پہلے پڑھ چکے تھے اور اس پر پوری طرح حاوی تھے، اس لئے ان کو خیال ہوا کہ درس سے ان کے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا مگر مرشد کا حکم تھا، اس لئے کتاب لے کر پہونچے۔ درس میں کسی مسئلہ پر حضرت نظام الدینؒ نے بحث کرنے کی کوشش کی۔ حضرت فرید الدینؒ کتاب بند کرکے اٹھ کھڑے ہوئے اور کئی روز تک حضرت نظام الدینؒ سے مخاطب نہیں ہوئے۔ مرشد کی یہ آزردگی دیکھ کر حضرت نظام الدینؒ نے ان سے پوچھا، کیا میں نے درس میں کوئی غلط بات کہی تھی؟ حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا نہیں، جو بات کہی تھی وہ تو صحیح تھی لیکن جس مقام اور انداز سے کہہ رہے تھے وہ صحیح نہ تھا"۔ (بزمِ رفتگان، حصہ اول از سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم، صفحہ ۳۱۸)

ایک صاحبِ قلم کا اہم تبصرہ

الفاظ کی مختلف نوعیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جناب سید غلام ربانی نے ایک زمانہ میں متعدد مضامین لکھے تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ کتابی شکل میں "الفاظ کا مزاج" (صفحات ۱۳۶) کے نام سے دستیاب ہے۔ اسے مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ نہایت قابل قدر اور لائق مطالعہ کتاب ہے، موضوع کی مناسبت سے اس کتاب کے دو اقتباسات پیش ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"زبان اپنے وسیع معنی میں خیالات ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے، جانوروں کی چیخیں بھی ایک حد تک زبان کہی جاسکتی ہیں بشرطیکہ ان کے دل کی حالت ظاہر کریں، الفاظ بامعنی آوازیں ہیں۔ چرند اور پرند بھی ایسی آوازیں نکالتے ہیں جن کے معنی ہوتے ہیں، وہ خوف ظاہر کرتے ہیں، خوشی اور خواہش بھی ظاہر کرسکتے ہیں مگر اپنے خیالات ظاہر نہیں کرسکتے۔ جانداروں میں ایک انسان ہی ہے جو کچھ وہ محسوس کرتا اور سوچتا ہے اس کو بیان بھی کرسکتا ہے۔ زبان وہ چیز ہے جس پر تمام انسانی تعلقات قائم ہیں۔ یہ الفاظ سے بنتی ہے اور الفاظ سانچے ہیں جن میں خیالات ڈھلتے ہیں، چنانچہ ہر لفظ جو کسی چیز کے لئے بنتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی خیال لپٹا ہوتا ہے" (صفحہ ۷)

اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے:

"کہتے ہیں کہ نام میں کیا دھرا ہے مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہے۔ نام کو شاندار بنانے کیلئے طرح طرح کی کوشش کی جاتی ہے۔ لوگ اپنے نام کے ساتھ میر، سید، مرزا خان وغیرہ کا اضافہ کرتے ہیں۔ بعض وقت نسبتی الفاظ بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے ملک میں جب تعلیم کی کمی تھی تو گریجویٹ حضرات نے بی۔ اے اور ایم۔ اے الفاظ کو اپنے نام کا جزو بنالیا تھا اور اگر وہ ولایت کی سند رکھتے تھے تو ڈگری کے ساتھ آکسن یا کینٹب لکھ دیتے تھے۔ اسی طرح ایک عرصہ پہلے کچھ انشاء پرداز اور شاعر اپنے نام کے ساتھ دہلوی یا لکھنوی لکھ کر رعب جمانے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اسم کو اپنے موسوم سے کچھ تعلق ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں نے جب کبھی موقع ملا، اس انسانی جذبہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ کا ایک شعر جو مرحوم نے جنگ کے متعلق کسی جلسے کے لئے لکھا تھا۔

اقبال میرے نام کی تاثیر دیکھنا
میں جس کے ساتھ ہوں اسے ہوتی نہیں شکست

غالبؔ نے بھی کہا ہے:۔

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام" (صفحہ ۱۶۔۱۵)

قرآنی الفاظ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ علم اور اصحابِ ادب، تذکیر و موعظت کے طور پر "قرآنی الفاظ" کی حقیقت کو بھی نگاہ میں لے آئیں۔ اس سلسلہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے درج ذیل تجزیہ کا مطالعہ بہت کافی ہوگا۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:

"جسے قرآن کا صحیح ذوق نصیب ہوگا اور عربی اسلوب پر اسے بصیرت ہوگی وہ دیکھے گا کہ قرآن اس انداز پر رواں دواں نہیں جو عامیانہ ہے۔ بلکہ قرآنِ کریم الفاظ کے انتخاب میں خود اپنا ایک معیار رکھتا ہے اور اس کا معیار نہایت صاف ستھرا، شگفتہ اور اس قدر جامع ہے کہ آپ قرآن کے کسی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لانے سے عاجز ہیں جو قرآن کے منتخب لفظ کی واقعی قائم مقامی کرسکتا ہو اور یہ اس لئے کہ مخلوق اشیاء کی حقائق پر صحیح اطلاع نہیں رکھتی اور وہ یہ بھی فیصلہ نہیں کرسکتی کہ یہاں کونسا لفظ حقیقت کی صحیح ترجمانی اور مقام کے واقعی مناسب و زیبا ہے"۔ (نقش دوام، صفحہ ۳۵۸)

الفاظ اور نظامِ اخلاق

الفاظ کی مختلف جہتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ کو حالات اور واقعات کے تابع ہونے چاہئیں اور جو لفظ جس کے لئے تاریخی اور روایتی طور پر استعمال ہوتا چلا آرہا ہے اس کی خلاف ورزی گویا نظام اخلاق میں خلل پیدا کرنا ہے۔ اللہ، رسول، نبی، فرشتہ، جنت، دوزخ، جل جلالہ، علیہ السلام، صلی اللہ علیہ وسلم، رضی اللہ عنہ، رحمتہ اللہ علیہ، مولوی، مولانا، علامہ، ایڈوکیٹ، انجینئر، ڈاکٹر، سائنٹسٹ، ادیب، شاعر، مکتب، مدرسہ، جامعہ، پرائمری، اسکول، ہائی اسکول، کالج، یونیورسٹی، یہ سب الفاظ اصطلاحی اعتبار سے مخصوص ہیں اور ان کے معنی ومطلب بھی متعین ہیں، لیکن آجکل بعض الفاظ کے استعمال کے سلسلہ میں بے احتیاطیاں اور بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں، ان میں ایک لفظ "جامعہ" بھی ہے، تعلیم بالکل ابتدائی یا درمیانی سطح کی ہوتی ہے، جس کو "مکتب" یا "مدرسہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، لیکن...... لوگ اسے "جامعہ اسلامیہ" سے موسوم کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض ادارے اپنی زندگی کے پہلے ہی دن سے "جامعہ اسلامیہ" کا لبادہ اوڑھے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ لفظ کا یہ غلط استعمال ہے۔ المعجم الوسیط (اول، صفحہ ۱۳۵) میں "الجامعہ" کے تحت یہ لکھا ہوا ہے "مجموعة معاهد علمية، تسمى كليات تدرس فيها الاداب والفنون والعلوم" یعنی مختلف علمی اور تحقیقی اداروں کا مجموعہ، جس میں متعدد علوم وفنون کی تعلیم اونچی سطح سے ہوتی ہو"۔ گویا یہ لفظ یونیورسٹی کا مترادف ہے، اسی لئے اڈوانسڈ ٹوینٹتھ سنچری ڈکشنری (مرتب پروفیسر بشیر احمد قریشی، صفحہ ۷۲۰) میں یونیورسٹی (UNIVERSITY) کا ترجمہ "جامعہ" سے کیا ہے اور تشریحی نوٹ میں یہ لکھا ہے "(Hagherst Seat of hearning) یعنی جہاں ابتدائی اور درمیانی نہیں بلکہ اعلیٰ اور اونچی تعلیم کا انتظام ہو، لفظ جامعہ پر اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۷ صفحہ ۴ تا ۵۷، شائع کردہ دانش گاہ پنجاب، لاہور) میں پوری تحقیق مختلف ممالک کی جامعات کے تعارف کے ساتھ موجود ہے جس میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملیہ کا بھی تذکرہ ہے۔ اہلِ ذوق کے لئے اس کا مطالعہ بھی مفید ہے۔ اسی طرح شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا (صفحہ ۵۹۶ تا ۵۹۸ شائع کردہ کراچی پاکستان) میں تفصیلی معلومات ہیں۔ راقم الحروف ایک عرصہ سے بعض اہلِ علم کی تنقید کی وجہ سے اس طرف توجہ دلانا چاہتا تھا، جس کا موقع آج مذکورہ عنوان کے تحت ملا۔ آخر میں جی چاہتا ہے کہ زیر نظر مضمون کو حکیم کنفیوشس کے اس اہم اور معنی خیز جملہ کو دہراتا ہوا ختم کروں کہ:

"ایک مصلح کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ صحیح الفاظ کا استعمال کرے"۔

☆☆☆

علامہ کشمیریؒ اور اُنکی فقہی خدمات

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری

جتنا آپ جانتے ہیں' اور جو نہیں جانتے اس سب کو لیجئے' بلکہ پوری کائنات رنگ و بو کو' تحقیق و کاوش کی آخری منزل' جستجو و تلاش کے انتہائی مرحلے پر' گہری تلاش اور حقیقت پر رسائی کے بعد علم و معلومات چھان بین' نتیجہ سب کا یہ ہی نکلے گا کہ جو کچھ ہوا' ہو رہا ہے' اور ہوگا' یعنی ماضی' حال اور استقبال' ہر چیز پر مرکزی کنٹرول' اقتدارِ کامل' ایک ہی واجب الوجود کا ہے۔

کائنات میں سب سے زیادہ جاندار و قوی' متحرک و فعال' ذی ہوش' ذی گوش' قلب و نظر' ذہن و فکر کی بے پناہ صلاحیتوں پر قابض و متصرف' انسان نہ اپنے ارادہ پر قادر' نہ اپنی مقدرت پر حاوی' جو کچھ کیا اور کر رہا ہے' سب کچھ اسی ماوراء ہستی کی قدرت و مشیت کے تحت' اس کو کہنے والے نے یہ کہہ کر حقیقتوں کو طشت از بام کر دیا تھا' "وماتشاؤن الاان یشاء اللہ" جب یہ صداقت و سچائی' حقیقت و واقعہ' مشاہدات و دلائل' واقعات و حوادث کی روشنی میں حقیقتِ ثابتہ بنکر سامنے آگئی' تو اب کہنے دیجئے' کہ تدوینِ حدیث اور پھر قانونِ اسلامی' یعنی فقہ کی جمع و ترتیب' کوئی بحث و اتفاق یا بغیر سوچے سمجھے منصوبے کا ثمرہ نہیں' جو کچھ ہوا' وہ خداوند تعالیٰ کی مشیت تھی' اور ازل میں طے شدہ حقائق کا انکشاف و ظہور' حدیث کے مدون اول امام زہریؒ نے اپنی ایک تالیف میں اشارۃ لکھا کہ "منضبط اور جمع ہونیوالی وحی کی اقسام میں سے ایک ہی وحی تھی' یعنی وحی متلو' خدا تعالی کا نازل کردہ' قرآن"

"الامام الکشمیری' درس میں اس جاندار مقولے کو نقل فرما کر بطورِ اضافہ و تشریح فرماتے کہ "زہریؒ الامام کی وضاحت سے میں یہ ہی سمجھا کہ مشیتِ الٰہی میں پہلا مرحلہ' قرآن کریم کی تدوین و ترتیب تھی" تفصیلات اہل علم کے خزانہ معلومات میں مہیا ہیں' جب یہ مرحلہ پوری کامیابی کے ساتھ طے ہوگیا' تو القرآن کی جامع اور ہر طرح منضبط تشریح' یعنی سرمایہ حدیث' کی تدوین کا مرحلہ سامنے تھا' طبعی طور پر منزل بہ منزل سفر یہی ہے کہ متن کے بعد اس کی شرح و شروحات سامنے آئیں اسی لئے الشافعی الامام برد اللہ مضجعہ بطور ادعا فرماتے کہ قرآن کے متن یا اس کے اجمال کی مکمل و مدلل تشریح صحیح احادیث ہیں' یہ بھی دعویٰ فرماتے کہ

کوئی بھی حدیث صحیح لاؤ اس کا ماخذ قرآن کریم سے ثابت کر دوں گا"۔ اور امام ہمامؒ کے اس دعوی پر خود انہیں کی جانب سے ہزاروں احادیث کا ماخذ القرآن سے متعین ہو گئے۔ عقل و ہوش سے بیگانہ خرد و فرزانگی سے محروم نکتہ چینوں نے امام بخاریؒ کے اس طرز پر اپنی دانست میں بھاری اعتراض یہ کیا کہ ترجمۃ الباب کے بعد قرآن کریم کی کوئی آیت پھر اس کے بعد مناسب حدیث؟

"امام کشمیریؒ اس واہی اعتراض کو نقل فرما کر ارشاد فرماتے" کہ دنیا میں بے ہودہ بے مصرف نکتہ چینوں کی بھرمار ہے۔ اور بلا وجہ ژاژ خائی کا انبار ہے بطور لطیفہ زبان پر آتا" کہ اہل نظر نے دنیا کے بہت سے نام تجویز کئے ہیں فرماتے کہ میں دنیا کو "بیت الحمیر" کہتا ہوں یعنی گدھا خانہ۔ گدھوں کو جب ایک جگہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ تو کسی اشتعال انگیزی کے بغیر۔ ایک دوسرے پر دولتیاں چلاتے ہیں اور دندان تیز کرتے ہیں۔ فرماتے کہ بجائے اس کے کہ بخاریؒ کے اس احسان کو تسلیم کیا جاتا کہ قرآن کے بڑے حصے کی اپنے اس طرز سے انہوں نے تفسیر کر دی۔ اور اس شاہکار کی قدر شناسی ہوتی کہ احادیث کے مآخذ کی نشان دہی کے ساتھ قرآن و حدیث کا باہمی رشتہ یا قرب و اتصال اور ہر دو میں ترتیب طبعی کو کھول دیا' لیکن فکر و نظر سے محروم طبقے نے بخاریؒ کے اسی اچھوتے انداز کو ہدفِ ملامت بنا لیا"۔

اضافہ اس کا بھی کیجئے کہ القرآن کی تدوین میں جس حزم و احتیاط' ثقاہت و دیانت' اور بے نظیر تدیّن کی ضرورت تھی خیر القرون ان تمام صفات کا پیکر جمیل تھا اب حدیث کی ترتیب کا مرحلہ ہے۔ تو مطلوب وسائل پوری قوت سے فراہم کر دئے گئے بے مثال حافظہ' منقطع النظیر یادداشت' امانت و دیانت' احتیاط و ثقاہت' شوق و طلب کا ولولہ کامل' اس راہ کی پر خار وادیوں کو طے کرنے کیلئے مسلسل اسفار' متواتر جدو جہد' ایک ایک حدیث کو معلوم کرنے کے لئے سینکڑوں میل کے متعب سفر' زہد و قناعت' توکل واستغناء' اہتمام عبادت' نظام تقویٰ' ہر طمع و آز سے علیحدگی' ان کاوشوں کا مرتب مجموعہ' مفصل تاریخ' امت کے ہاتھوں میں ہے جسے اپنوں نے نہیں غیروں نے بھی تسلیم کیا خیر خواہ ہی نہیں نے بلکہ بد اندیش بھی سراپا اعتراف ہیں' گویا اسلامی قانون کے دو اہم ماخذ بھرپور انداز میں مہیا ہو گئے' یعنی قرآن و حدیث۔

تیسرا مرحلہ: قانون کے استنباط و استخراج' قوانین کے جمع و انضباط کا ہے یہاں پر بھی خدائے قادر و توانا' فیاض و جواد نے ان اشخاص و رجال کو کھڑا کیا' جنکی نظیر تا قیامت مہیا نہ ہو گی۔

فقہ یعنی اسلامی قانون کے لئے کیا چیزیں مطلوب ہیں' وفور علم' معلومات کا قلزم' ذکاوت و ذہانت کے ہمالئے فہم و تدبر کے دریا' فراست و فطانت کے پہاڑ' روشن ضمیر' روشن دماغ' ظاہر' مجلّی' باطن مطلّی' عبادت و ریاضت' زہد و قناعت' توکل واعتماد علی اللہ' استغناء و بے نیازی' شجاعت و بسالت' عزیمت و ہمت'

اخلاص فی العلم، خلوص فی التعلیم، حسن نیت، ایثار، بے مثل احتیاط، تقویٰ و تورع، طہارت قلب و نظافتِ فکر، تخیل فلک رسا، تخیل فلک پیما، اجتہادی قوت، استنباط کا ملکہ راسخہ، استخراج کی دولتِ بے بہا، موشگافی، اور حدیث و قرآن کے رموز و اسرار پر تام اطلاع، ناسخ منسوخ کا علم، حدیث کو پرکھنے کی بھرپور صلاحیت، غث وسمین، قوی و کمزور، ضعیف و مرجوح، میں امتیاز کی مکمل دستگاہ وغیرہ۔ اسلئے معروف چار فقہاء اور غیر معروف کی حیات، علمی کارناموں، سوانح، و تذکروں کو کنگھال ڈالئے، انشاء اللہ حاصل مطالعہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا، کہ مذکورہ سطور میں جن اوصاف و صفات کی تعیین کی گئی ہے، ان سب کا عطر مجموعہ، یہ بلند و بالا شخصیتیں ہیں تفصیل کے لئے تو وقت مہیا نہیں، نہ گردو پیش مساعد، تاہم ماضی الضمیر کو سمجھانے کے لئے کچھ واقعات دلیل و شاہد کی حیثیت سے پیش ہیں۔ سفیان ثوریؒ امیر المؤمنین فی الحدیث، سید الطائفہ اور اپنے عہد کے ممتاز ترین فقیہ تھے، فرماتے ہیں کہ "مجھے سب سے زیادہ دشواری نیت کی تصحیح میں پیش آئی"۔ حسن بصریؒ کو کون نہیں جانتا، سید التابعین، سید المؤمنین سید الفقہاء، غرضیکہ بلند و بالا، عنوانات میں سے، کسی کے ساتھ بھی "سید" یا قدوہ لگا لیجئے ہر ایک، اس مردِ مؤمن و خود آگاہ کے قامت زیبا پر استوار ہوگا، انہی کے سانحہ وفات پر سفیان ثوریؒ نے نماز جنازہ و تدفین میں شرکت نہیں کی، رسول اکرم ﷺ کی اس ترغیب و تنبیہ کی روشنی میں کہ مسلمان جنازہ میں شرکت اور تدفین تک مشایعت اجر عظیم کا موجب ہے سفیان ثوریؒ کا یہ عمل، کتنا عجیب و غریب ہے پوچھنے والے نے پوچھا، تو ثوریؒ کا جواب یہ تھا کہ برائے شرکت میں اپنی نیت صحیح نہیں کر سکا، کچھ آپ سمجھے، یہ چند سطور جو نیت سے متعلق قلم پر بے اختیار آ گئیں۔ یہی ذہن نشین کرنے کے لئے ہیں کہ نیت اور حسن نیت کیسی مہتم بالشان چیز ہے، اقوال و اعمال کی روح، مقبولیت و مردودیت کی میزان، غور کیجئے، کہ محدثین و فقہاء کی نزہت نیت پر کیا اب بھی کسی اضافے یا تفصیل کی ضرورت باقی رہی۔

عصر حاضر میں جو اجتہاد کا غوغا پا ہے، قطع نظر ان تفصیلات کے جو ابھی خاکسار پیش کرے گا، نظافت نیت ان متنورین کو کہاں تک حاصل ہے؟ آیئے اب اس جانب ابو حنیفہ الامامؒ کی نکتہ سنج طبیعت نکتہ آفریں نہاد، فقیہ الشال ذکاوت و ذہانت، بے نظیر فراست و خطابت کے، واقعات ایک دو نہیں، بلکہ قدم بقدم مہیا ہیں، یہاں تک کہ ان کا پورا فقہ اس پر شاہد عدل ہے، استاذ الاساتذہ، حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ المعروف بشیخ الہند، طاب ثراہ فرماتے "کہ جس مسئلہ میں امام الہمامؒ قطعاً منفرد ہوتے ہیں، تا آنکہ ان کے براہ راست تلامذہ کی بھی تائید و اتفاق میسر نہیں ہوتا مجھے یقین ہوتا ہے کہ ابو حنیفہؒ ہی کی رائے، اصابت و صواب کی جلوہ فرمائی کر رہی ہے اور یہ ایسی اونچی بات ہے، جہاں تک امام ہمامؒ کی ہی رسائی ہو سکتی ہے، اہتمام، عبادت

بلکہ اسمیں اشتغال کا یہ عالم تھا۔ کہ وفات کے بعد کسی نے امام ہمامؒ کی رہائش گاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ایک ستون تھا' جو چند روز سے نظر نہیں آتا بتانے والوں نے بتایا کہ ستون نہیں بلکہ عماد الدین "ابو حنیفہؒ" الامام تھے "جو شبہائے تار طولِ قیام' طویل رکوع' اور دراز سجدوں سے لبریز رکھتے' دیانت کا یہ عالم کہ کپڑے کے ایک تھان کی غلط فروختگی پر سال بھر اسکا اعلان کہ ایسا ناقص تھان نکل گیا خریدنے والا چکائی ہوئی قیمت واپس لیکر تھان واپس کر سکتا ہے' جود وسخا' جس سے انتفاع نہ صرف تلامذہ' و معاصر علماء کر رہے تھے' بلکہ ہر ضرورت مند' اور ہر سائل کے سوال کی تکمیل اسی امام کے کیسہائے زر کرتے اقتدار' و جلیل مناصب سے گریز کے واقعات تو تاریخی حقائق ہیں' بلکہ امام کی جان بحضور جان آفرین' انہی مناصب کے قبول نہ کرنے کے نتیجہ میں پہونچی' سفیان ثوریؒ' امام اعظم مسعر ابن کدام وغیرہ کا واقعہ' جو امام ہمامؒ کے سوانحی تذکروں میں نظر افروز ہوگا' کس قدر عبرت خیز ہے' اعلائے کلمۃ الحق کیلئے جرأت و بسالت تاریخ کی امانت ہیں' کہاں تک پیش کیا جائے امام ہمامؒ سے متعلق تفصیل کو' سیدنا مالک ابن انسؒ کا حظیرۃ القدس سرزمین مدینہ کا احترام کہ برہنہ پا چلتے ہیں' اور قضائے حاجت کے لئے مدینہ سے دور دراز نکل جاتے ہیں' اس دیار محبوب کو اس اندیشہ کے پیش نظر نہیں چھوڑتے کہ کہیں موت مدینہ سے باہر امام کی جان نہ لیلے' نکتہ رسی کا یہ عالم کہ امام شبابی دور سے گذر رہے تھے' اور مسجد نبوی زادہ اللہ شرفاً و تکریماً کے ایک گوشے میں تازہ وارد معلم کی حیثیت میں کہ بستی میں' کسی عورت کی میت کو غسل دیتے ہوئے چند عورتوں میں سے ایک نے اپنی متعارف عادت کے مطابق کہا کہ مرنے والی بڑی بدکار تھی' یہ کہنا تھا کہ غسالہ کا ہاتھ مردہ جسم کے عضو مخصوص پر جا چپکا اور ایسا چپکا کہ چھڑانے کے لئے نہ صرف اپنی توانائی کو نچوڑ دیا بلکہ' شریکِ غسل عورتوں کی بھی قوتیں جواب دے گئیں۔

مدینہ کے علماء سے' جن میں بزرگ بھی تھے' اور پرانے بھی نکتہ آفریں بھی' تھے اور نکتہ سنج بھی' سر پر پڑی اس مصیبت کا کوئی حل جب نہ ہو سکا' تو مالک الامام ہی حقیقت تک پہونچے' فرمایا کہ میت پر تہمت تراشی کی گئی ہے۔

حدِ قذف جاری کئے بغیر ہاتھ جدا نہ ہوگا' اور اسی تدبیر نے گلو خلاصی کی راہ ہموار کی' حدیث کا وہ احترام کہ کسی محدث کی جمی ہوئی مجلس میں مالکؒ پہونچے' شریک مجلس ہونے کے بجائے روانہ ہو گئے' دریافت کرنے پر فرمایا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے ارشاد کو کھڑے کھڑے سننا سوائے ادب ہے' جبکہ مجلس میں بیٹھنے کی گنجائش نہ تھی امیر وقت نے چاہا کہ مالکؒ قصر امارت پہونچ کر حدیث سنا دیں' مالکؒ نے صاف انکار کر دیا' انکا وہ طمطراق' وقتِ درس' مجلس کی شرکت و شان اہل علم سے مخفی نہیں۔

اب لیجئے! الشافعی الامامؒ ذہانت کی محراب' فطانت کا منبر' ذکاوت کا صحیفہ' ثقاہت کا وثیقہ علم کا پیکر زیبا' نکتہ شناسی کا امام' ایک دستِ مبارک میں قاطع سیف' دوسرے میں مخالف کے حملے کو روکنے کے لئے مضبوط ڈھال' المکی القرشی' ان کے ایک بااختصاص شاگرد کا بیان ہے کہ امام ہمامؒ کے ساتھ میں چل رہا تھا' اور ہم سے آگے ایک شخص' میں نے عرض کیا کہ "امام فرمایئے' اس راہرو کا پیشہ کیا ہے' الشافعیؒ نے اچٹتی ہوئی نظر ڈالی' فرمایا کہ بڑھئی ہے یا لوہار' یہ ہی تلمیذ رشید کہتے ہیں کہ میں نے بڑھ کر اس راہرو سے پیشہ معلوم کیا تو بتایا کہ پہلے نجاری کرتا تھا اور اب حدادی'

"للام الکشمیریؒ کچھ نہیں' پکے حنفی ہونے کے باوجود کبھی الشافعی الامام کو سید الازکیاء فرماتے' تو گاہے "رئیس الازکیاء"

انہیں کے فقہ کے مقابل ابوحنیفہؒ الامام کے تفقہ کو ترجیح دینے کا وقت آتا تو بے اختیار زبان مبارک پر آجاتا کہ دنیا میں کوئی ہے' جو الشافعی الامام کو خاموش کرے' استفہام برائے انکار پھر جوابی تقریر کا آغاز یہ تھا کہ "میں اپنی بساط کے مطابق گفتگو کرتا ہوں" ذرا حصولِ کمالات کے لئے' الشافعی الامام کی بلند پروازی دیکھئے' فرمایا کہ سولہ (۱۶) سال سے میں نے سیر شکم ہو کر کھانا نہیں کھایا' حاضرین کے استعجاب پر زبان گہربار پر آیا "کھانا زیادہ کھانے کے نتیجے میں پیاس لگتی ہے اور پانی کی وافر مقدار کسلمندی لاتی ہے' جو حصولِ کمالات میں مانع ہے" بایں ہمہ کمالات اپنے استاذ الامام محمد ابن حسن الشیبانی' تلمیذ ابی حنیفہ الامامؒ کے ایسے معتقد تھے کہ ایک سائل کے سوال کا جواب عنایت فرمایا' تو اس انگھڑ نے سنکر کہا دوسرے فقہاء تو یہ کہتے ہیں' امام غضبناک ہوگئے' فرمایا کہ کیا تم نے فقیہ کو دیکھا ہے' یہ بھی ارشاد ہوا کہ ہاں اگر امام محمدؒ کو دیکھتے تو فقیہ کو دیکھتے' اسلامی علوم وفنون کا کونسا ایسا شعبہ ہے' جس پر الشافعی الامام کی دسترس نہیں تا آنکہ شعر گوئی کا وہ ملکہ راسخہ کہ مصرعہ اول میں یہ فرماتے ہوئے کہ اگر شعر گوئی' علماء کے شایانِ شان ہوتی تو' لکنت اشعر الیوم من لبید حقیقت آفریں دوسرا مصرعہ امام ہمامؒ کی زبانِ مبارک پر آگیا' پھر کیا اس واقعہ کو سنانے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ امام نے اپنی جانشینی کے وقت وفاشعار خدمت گذار شاگرد پر' ایک مستند شخصیت کو ترجیح دی' جو رسول اکرم ﷺ کی اس تنبیہ وتخویف پر جما جمایا عمل تھا" اذاوسِدَ الامر الی غیر اھله فانتظر الساعة" اب سن لیجئے بطلِ جلیل امام نبیل احمد ابن حنبلؒ کی عزیمت کی داستان!

پابہ زنجیر' ہاتھوں میں ہتھکڑیاں' نور کا پتلا' از سر تاپا معصومیت' پولیس کے حصار میں کشاں کشاں دار السلطنت کی جانب لایا جارہا ہے' دنیا حیرت زدہ ہے کہ اس قیدی کا ظاہر چیخ کر اسکی معصومیت کا اعلان کر رہا ہے' نہ یہ قزاق ہے' نہ جیب تراش' نہ غارت گر' کوئی ڈاکو اسکا چہرہ بشرہ بتلاتا ہے کہ یہ شراب کے قریب

کبھی نہیں پھٹکا' نہ کسی بدکاری کا مرتکب اسکے چہرہ پر نور یہ متشرع یہ اتباع سنت کی چلتی پھرتی تصور پھر کون ہے! جس نے اسکو اس انداز میں قید کیا' اور کیا اسکا جرم ہو سکتا ہے' اسکے ساتھ گرفتار ہونیوالے قیدی ایک ایک ہو کر رخصت ہو رہے ہیں' حکومت کے جاہ و جلال کے سامنے' انکے حوصلے شل ہو گئے' اور ان کی ہمتیں ٹھٹر گئیں یہ معصوم قیدی روزہ سے ہے اور دنیاوی جلال و جبروت شوکت شاہی اور فرخسروی کے سامنے کھڑا ہوا' دربار لبریز ہے' خود امیر گفتگو شروع کرتا ہے' پہلے ترغیب' پھر ترہیب' گفتگو کچھ اس انداز کی ہے' احمد! قرآنِ کریم کے بارے میں اپنے موقف کو چھوڑ دو' اور وہی کہو جو ہم کہہ رہے ہیں اور تم سے کہلانا چاہتے ہیں' تو تمہیں بڑی عزتوں کے ساتھ رخصت کیا جائیگا۔

ظلمتوں کی گھٹاٹوپ اندھیروں میں ایک خارا شگاف آواز "قرآن و حدیث سے اپنے نظریے پر دلیل پیش کرو" یہ آواز اسکی تھی جس کا جسم ناتواں' لیکن سینہ میں موجود قلب چٹانوں سے زیادہ مضبوط' ادھر سے بار بار یہ ہی مطالبہ' ادھر سے یہ ہی جواب۔

امام کی اس استقامت کا بجز اسکے کیا جواب تھا کہ وقت کا طاغوت اپنی طغیانی کا مظاہرہ شروع کر دے' اسکی آنکھیں شرربار تھیں' غیظ و غضب کے فوارے پھوٹ رہے تھے' امام کے جسم مبارک سے کرتا نوچ لیا گیا اور تازہ دم جلاد کو بے تحاشہ کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا' اپنے خدا کے اس باوفا کو اپنی جان سے زیادہ خطرہ اس کا تھا کہ کہیں کشفِ عورت نہ ہو جائے اپنے ازار بند کو اپنی گردن میں باندھ لیا' پٹنے والا پٹ رہا ہے' اور تازہ سیاط برابر بدلے جا رہے ہیں اور اس طرح ظلم و عدوان کی تمام منزلیں طے کر لیں گئیں' مگر امام ہمامؒ کی عزیمت کو شکست نہیں دی جا سکی۔

دوسری طرف دیکھئے! کئی روز کا مسلسل فاقہ ہے! امام نماز کیلئے باہر تشریف لاتے ہیں ناتوانیوں کے اس ڈھیر نے چند قدم اپنی قوتِ ارادی سے اٹھائے مگر ضعف نے ایک جھٹکا دیا' اور کائنات کا یہ مقدس ترین انسان لڑکھڑا کر گر گیا' اور قناعت کا یہ پیکر' صورتِ واقعہ کو' چھپانے کی تمام کوششوں کے باوجود گرسنگی کے حملے کی تاب نہ لا سکا۔

دیکھنے والے سمجھ گئے کہ امام احمدؒ کس کشمکش میں مبتلاء ہیں' کسی نے دوڑ کر اپنے گھر سے چند مٹھی آٹا' اہلیہ مطہرہ تک پہونچایا' اس پاکیزہ نہاد بی بی نے' نمک سے گوندھ کر اپنے نورِ نظر کے جلتے ہوئے تنور میں دو چار روٹیاں سینک لیں' امام واپس گھر میں تشریف فرما ہوئے یہ ہی سالن سے محروم روٹیاں آپکے سامنے رکھ دی گئیں' آٹے کی پیش کش سے لیکر نانِ جویں کی تیاری تک کی داستان بی بی سے سن کر فرمایا انھیں سامنے سے اٹھالو یہ میرے اس لڑکے کے تنور میں سینک لی گئیں جو سرکاری ملازمت میں ہے' "اللہ اکبر" اس

تقویٰ کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے عاجز ہے' یہ ملازمت کسی غیر مسلم حکومت کی نہیں تھی' مسلم حکمراں تھا' اور لختِ جگر اپنے فرائض کی ادائیگی میں مستعد' حاکمانہ جور و استبداد سے قطعاً بے تعلق مگر احمد کا تقویٰ انکا زہد' انکا توکل انکی استغنائی ادائیں' اس نان خشک کے چند لقمے بھی برداشت کرنے کی روادار نہیں' بظاہر میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں' لیکن ائمہ اربعہ سے متعلق یہ مختصر سوانحی خاکے ہمارے اس منحوس عہد کے ان ادعائی نعروں کا کھوکھلا پن' نمایاں کرنے میں کار آمد رہیں گے' کہ اجتہاد و استنباط کو عربی سے معمولی شدبد کی بنا پر سہل ترین سمجھ لیا گیا'' اور بزعمِ خود'' اسلامی ماخذ سے قوانین کے استنباط کو ھنیئاً مرئیاً گردان لیا گیا'

جلال سیوطیؒ جنکے تبحر و وسعتِ معلومات میں قیل و قال کی گنجائش نہیں'' تعمق'' اور چیز ہے' اربابِ تحقیق انکی گہرائی و گیرائی کے معترف تو نہیں تاہم انکے؟ علوم و کمالات کے سب ہی قائل ہیں اپنی حیات طیبہ کے بعض مراحل میں وہ خود کو'' مجتہد'' سمجھتے' اتفاقاً جس مجلس میں دعویٰ اجتہاد ہوا' وہیں کسی کے مسئلہ پوچھنے پر سیوطیؒ حل پیش کرنے سے عاجز رہے۔

''الامام کشمیری فرماتے' کہ میرے نزدیک اسلامی علوم و فنون میں' سب سے دشوار رفقہ ہے یہ بھی زبان مبارک پر آتا' کہ'' میں ہر فن میں اپنی رائے رکھتا ہوں'' مگر فقہ میں ابو حنیفہؒ کا مقلد محض ہوں''

سوال یہ ہے کہ فقہ کیا ہے؟ اہل علم کے مطالعہ میں تعریف فقہ کی تمام تفصیلات موجود ہیں' مگر ابو حنیفہ الامام سے' '' معرفة النفس الخ منقول ہے''

''کشمیری الامام اسی منقول تعریف کو راجح قرار دیتے''

عرض یہ کرنا ہے کہ مفید اور مضر' یعنی ماموارت و منہیات' یا معروف اور منکر' آگے بڑھیے' خیر و شر' نیک و بد' ان سب کا علم یا خدا تعالیٰ کے کلام سے ہوگا' یا رسول اکرم ﷺ کے ارشادات سے' یہ دونوں بنیاد ماٗخذ ظاہر و باطن' روح و جسم' عبادات سے تا معاملات' انسانی زندگی کے ہر شعبہ و گوشہ' معاشرہ کے ہر نشیب و فراز میں' بھر پور رہنمائی کرتے ہیں' تو حاصل یہ نکلا' کہ فقہ' جو قرآن و حدیث کا عطر مجموعہ ہے' وہ ہی ہماری زندگی کی تمام سمتوں' جوانب اور راہوں میں قندیل روشن کرتا ہے' مگر افسوس اسکا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اسی فقہ کو ماننے سے منکر' تقلید' یعنی قانونی جکڑ بندی پر عدمِ تقلید یعنی لاقانونیت کو' ترجیح دیتا ہے' حالانکہ' سوچنے کی بات ہے کہ قانون حکومت و حکمراں کا رعایا کی فلاح و بہبود' انہی قوانین کی پابندی میں ہے' اور جب فقہاء نے جو کچھ کہا سنا' سب کچھ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے تو ترکِ تقلید کا کھلا مطلب' قانونی جکڑ بندیوں کو توڑ کر شترِ بے مہار زندگی گذارنے کا آسان راستہ ہے' غم بالائے غم اسکا ہے'

کہ مقلدین خود آپس میں الجھ گئے' اور ایک دوسرے کی تردید و تغلیط میں نہ صرف زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے بلکہ طغیاں عقل' کی لرزہ خیز موجوں نے عقل و فرزانگی کے ساحل سے ٹکرا کر نہ صرف ساحلی حد بندیوں کو توڑا بلکہ ہلاکت خیزی کی داستانِ عبرت اپنے پیچھے چھوڑ دی' کوئی ٹھکانہ ہے اسکا! کہ شوافع نے ایک عوامی اجتماع کیا' اسٹیج پر اربابِ جبّہ و دستار' تشریف فرما ہوئے حنفی فقہ کی تضحیک کے لئے ایک سوال کے جواب میں کہا گیا' کہ اس مسئلہ میں ابو حنیفہؒ کا رسول ﷺ سے اختلاف ہے' اس چیرہ دستی پر احناف کہاں نچلے بیٹھنے والے تھے' انہوں نے بھی چند دن کے بعد جوابی حملہ کیا' وہ ہی مزین اسٹیج وہی دستار بر سر و عبا در بر اہل علم کی پرہ بندی' ایک سوال کا جواب یہ تھا' کہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا خدا سے اختلاف ہے ''نعوذ باللہ من طغیان العقل و سکراتہ''

ان جاہلانہ جھگڑوں سے پہلے چاروں ائمہ کے متبعین کس رواداری کس مسالمت کا مظاہرہ کرتے تھے برائے عبرت اسے بھی سن لیجئے مشہور حنفی امام دامغانیؒ' جس گذرگاہ پر تھے اسکے کنارے مسجد تھی یہاں کے امام شافعیؒ مسلک کے مشہور محقق ابو اسحاق شیرازی تھے چلتے چلتے دامغانی نے محسوس کیا کہ نماز کا وقت قریب ہے' مسجد میں تشریف لے گئے' ابو اسحاق نے انکو دیکھ کر شافعی موذن کو تنبیہ کی کہ اذان میں ''ترجیع'' نہ کرنا اور امامت کے لئے دامغانی کو مصلے پر کھڑا کر دیا گیا' اس امام بلند مقام نے بطرزِ شوافع نماز پڑھادی' اور ہونا بھی یہ چاہیئے تھا۔ اسلئے کہ کون کہتا ہے کہ ابو حنیفہؒ ہی حق پر ہیں باقی ہر سہ فقہ از اول تا آخر باطل' جب تمام قیل و قال کا حاصل صرف راجح و مرجوح کے دائرہ میں گھوم رہا ہے تو یہ بلاوجہ کے بلاخیز ہنگامے' امت میں شقاق و انشقاق کے موجب تو ہو سکتے ہیں' ان سے اتفاق و اتحاد کا آبِ حیات' مہیا نہیں ہو سکتا۔

''الامام الکشمیری قرآن و حدیث کے وافر علوم کے نتیجہ میں امت کے باہمی اتحاد کی اہمیت کو سمجھ چکے تھے' اسلئے انہوں نے فقہ میں اجتہادی و اتحادی مسلک اختیار کیا' جسکی تفصیل یہ ہے کہ' وہ تطبیق بین الاقوال الائمہ کی ہر حال میں کوشش فرماتے' اسلئے وہ احناف میں سے کسی ایسے قول کو ترجیح دیتے' جو باقی تینوں ائمہ سے قریب تر ہو عموماً انکا ذوق یہی ہے' انکے اس رجحان کو سمجھنے کیلئے خود انکی منصوص رائے یہ ہے۔ ''میری عادت ہے کہ اولاً وہ قول لیتا ہوں جسکی تائید احادیث صحیحہ سے ہوتی ہے اسکے بعد وہ قول اختیار کرتا ہوں جو امام طحاویؒ کا مختار ہو' اور امام طحاوی کو کرخی پر ترجیح دیتا ہوں اگرچہ امام طحاوی مصر میں اور کرخی بغداد میں رہے لیکن میں جانتا ہوں حدیث میں امام طحاوی بے نظیر ہیں' اور پھر ان کا تفقہ صحیح تر ہے''۔

یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''فقہاء میں سے شمس الائمہ حلوانی کو سرخسیؒ پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ شمس الائمہ' مسئلہ مختلف بین الائمہ میں نہایت صحیح قول اختیار کرتے ہیں' میرے نزدیک ہمیشہ انکا قول مختار ہوتا

ہے، یہ بھی کہتا ہوں کہ بعد میں شامیؒ صاحب ہدایہؒ، صاحب بدائع قاضی خان، صدر الائمہ، فخر ائمہ میرے نزدیک سب برابر ہیں"

یوں بھی وہ شامیؒ کے تفقہ پر حضرت شاہ عبد العزیز الدھلوی اور متاخرین اکابر میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کے تفقہ، کو ترجیح دیتے انکی خود رائے یہ تھی،

میرا گمان ہے کہ اسلام کی ابتدائی آخری تین صدی کے بعد سے تفقہ نابود ھے"

حدیث فہمی کیلئے تفقہ، کو وہ کس قدر ضروری قرار دیتے، مشہور مسئلہ، میلاد مُروّج میں قیام جائز ہے یا نہیں؟ حافظ ابن حجرؒ اور جلال الدین سیوطیؒ کا رجحان قیام کی جانب ہے، اور مشہور حدیث "تو مولسید کم" کو حجت بنایا ہے، اس پر فرماتے کہ، یہ حالت علم حدیث کے اجل فاضلین کی ہے کہ امر متیقن و مشاہد پر ایک امر موہوم وغیر مشاہد کو قیاس کرتے ہیں میرے نزدیک اس فاش غلطی کی بنیاد تفقہ کا نابود ہونا ہے، میں کہتا ہوں کہ ابن حجرؒ حدیث کے پہاڑ ہیں اگر کسی پر گر جائیں، تو اسے ڈھا ہی دیں، لیکن فقہ میں درک نہیں، فقہ کے ساتھ حدیث کو بھی ضروری قرار دیتے، چنانچہ ہندوستان کے ایک فاضل جنکا گروہ اب ان کو امام کی حیثیت دے رہا ہے، اور چاہتا ہے کہ سب ہی انکو امام تسلیم کرلیں۔" علامہ کشمیریؒ فقہ میں انکی دستگاہ کے اعتراف کے باوجود حدیث سے انھیں نابلد قرار دیتے، اور یہ بھی فرماتے کہ انکا صراط مستقیم سے انحراف حدیث سے ناواقفیت ہے۔"

خاکسار عرض کرتا ہے کہ اس بلند پایہ رائے کو سن کر بہت سی جبینوں پر غیظ و غضب کی شکنیں نمایاں ہونگی، اور عجب نہیں کہ فرطِ غیظ و غضب میں وہ پھٹ پڑیں، اور اپنے امام کیلئے حدیث دانی کے دلائل و شواہد بہم پہونچانے لگیں حالانکہ انکا یہ سارا غیظ و غضب صرف اس بنا پر ہوگا کہ انھوں نے حدیث کے فن کو سمجھا نہیں، انکے یہاں حدیث کے تراجم، تشریحات، ضعیف، وقوی کا علم وغیرہ دعوی حدیث دانی، کیلئے کافی ہے، حالانکہ فنِ حدیث اسقدر بلند و بالا، ایسا وسیع و عریض اور اسقدر دشوار واقع ہوا ہے کہ بقول

"کشمیری الامام اس علم کیلئے چوراسی (۸۴) علوم بطور وسیلہ مطلوب ہیں، راقم السطور نے محاذ آرائی، یا مناظرہ بازی سے، بچنے کیلئے ان "فاضل" کے نام کا اخفاء کیا اگر یہ چیختے چلاتے ہیں، اور حسبِ عادت سب و شتم کے تیر پھینکتے ہیں، تو میں انھیں معذور قرار دونگا، چونکہ یہ مسکین ناآشنائے علم، علم حدیث کی حقیقت اور اسکے طول عرض سے واقف نہیں، بہر حال!

"علامہ کشمیریؒ کا خصوصی ذوق یہ تھا کہ وہ فقہ کو حدیث کے تابع رکھتے اس قضیہ کو منعکس کبھی نہ فرماتے، عموماً فرماتے کہ "حدیث سے فقہ کی طرف آنا چاہیئے فقہ سے حدیث کی طرف نہ جانا چاہیئے۔"

جس کا بے غبار مطلب یہ ہے کہ مسئلہ 'پہلے سے ذہن میں موجود' یا کوئی جزئیہ پھر اسکی تائید و پشت پناہی کیلئے کسی مناسب حدیث کی تلاش اسی تک ودو کو قطعاً غلط قرار دیتے حدیث سے مسئلہ نکلے گا' نہ کہ جزئیات و مسائل کے اختراع کے بعد مفید و کار آمد احادیث کی تلاش' وفقہ سے متعلق انکی یہ بنیادی و اساسی رائے' جس عمیق علم حدیث کو چاہتی ہے' خدا تعالیٰ کے فضل سے انکو میسر تھا' چنانچہ فرماتے کہ "میرا مطالعہ و نظر بہت سے شراح حدیث سے زیادہ ہے' اور حافظ ابن حجرؒ سے بھی تتبع طرق و اسانید میں تو کم' لیکن معانی حدیث میں ان سے زیادہ کلام کر سکتا ہوں' پس جن پر کلام کرتا ہوں' ان سے زیادہ جانتا ہوں' یہ بھی فرمایا کہ ابن حجر کا موضوع معانی حدیث نہیں ہے اس لئے ہر جگہ ان سے بڑھ جاؤں گا یہ فرما کر طلباء کو مخاطب کیا کہ جاہلین یہ نرا دعوی نہیں ہے' فقہ حنفی کی ترجیح کی وجہ انکی نظر میں یہ ہی تھی کہ حنفیہ کی اکثر جزئیات احادیث سے نکلیں گی بخلاف دوسرے مذاہب کے ان کے یہاں تخصیصات زیادہ ہیں' اس لئے فرماتے ہیں کہ "حنیفہ کا مذہب زیادہ اسفر و روشن ہے"

میں نہیں عرض کر سکتا کہ میرا اپنے موضوع سے انحراف کوئی نادانستہ جرم ہے یا مقصد کو سمجھانے کے لئے یہ طول بیانی و دراز نفسی ضروری تھی' میں تو یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جو کچھ عرض کرنا ہے' اسکے لئے طویل تمہید ضروری بھی تھی' اور اہم بھی' اب آیئے فقہ حنفی کے لئے انکی خصوصی کوششیں سب سے پہلے سنئے 'فرماتے' کہ "احناف پر امام طحاویؒ کے جتنے احسانات ہیں کسی اور کے نہیں' اور مسائل خلافیہ کی تفہیم کے لئے جس قدر میں نے لکھا' کسی اور نے نہیں لکھا' ایک اور موقع پر فرمایا کہ 'حنفیت کے استحکام کے لئے جس قدر مسالہ میں نے جمع کر دیا سو سال کے عرصہ میں اتنا کوئی نہیں جمع کریگا" فرمایا کہ "میں نے اسقدر سامان جمع کر دیا ہے کہ اگر سامنے آجائے تو حنفیت کسی اور تائید کی منتظر نہ رہیگی" مگر افسوس کہ میری تنقیحات و مویدات کو جمع کرنے کیلئے کوئی صاحب سواد میسر نہیں آیا" مرحوم کی سعی مشکور کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے!

اولاً تو انکا درس و تدریس' مجالس' اور عوامی تقاریر' مرحوم کی مجالس واہی تباہی چیزوں سے قطعاً خالی تھیں غیبت' اور بدگوئی سے شدید نفرت فرماتے' اگر کوئی ناواقف غیبت کا مکروہ دروازہ کھولنا چاہتا" تو حسبنا اللہ و نعم الوکیل الخ" جو انکا وردِ زباں تھا پڑھتے ہوئے دوسری جانب' متوجہ ہوتے' مجالس میں بیٹھتے ہی فرماتے کہ "بھائی پوچھو" اسپر بھی اگر کوئی علمی سوال نہ کرتا' تو خفگی کے ساتھ فرماتے کہ "کیا میں قبرستان میں بیٹھا ہوں" علمی سوالات سے بہت مسرور ہوتے اور انکے جواب کے لئے مستعد' آخر کے چند سال' جن میں فتنہ قادیانیت کا استیصال انکا محبوب مشغلہ تھا کو چھوڑ کر' حیات طیبہ کے ابتدائی سنوات' صرف حدیث'

قرآن، فقہ، علوم وفنون، کی مشکل کشائی، انکی غذا اور وح تھی، عام تقاریر میں بھی "علمی مہمات کو حل فرماتے، ملتان میں ایکبار جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ " شوکانیؒ کے سپرد ایک موضوع کرو، اور مجھے بھی وہی موضوع دو بغیر مراجعتِ کتب تالیف کی پابندی عائد، ہو پھر دونوں تالیفات کا موازنہ ہو"

اور یہ تو اکثر زبان پر آجاتا ہے "انا اعلم بالشوکانی" یہ بھی فرماتے "کہ " شوکانی سب کو اپنا مقلد بنانا چاہتا ہے۔ مگر وہ جیسے ہیں ہم خوب جانتے ہیں، غرضیکہ عوامی مجالس سے لیکر تا درس و تدریس انکا پسندیدہ موضوع علمی دقائق کو حل کرنا تھا، ظاہر ہے جب مہماتِ کتب حدیث انکے زیر درس ہیں، تو حنفی مسلک کی تائید و ترجیح کو کس بلیغ طریقہ پر انجام دیتے ڈابھیل کے آخری سال کے درس میں فرمایا "میں نے اپنی عمر کا تیس سال سے زائد عرصہ یہ دیکھنے میں گذار دیا، فقہ حنفی حدیث کے مطابق ہے یا نہیں، سو میں اپنی تیس سالہ کاوش کے بعد مطمئن ہوں کہ جہاں جس درجے کی حدیث دوسروں کے پاس ہے اسی وزن کی احناف کے پاس بھی ہے، اور جہاں حدیث نہ ہونے کی بناء پر احناف نے مسئلہ کی بنیاد قیاس پر رکھی ہے وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں"

حنفیت کے اس استحکام و تائید کا نتیجہ کیا نکلا، مشہور وممتاز، شیخ طریقت، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب، رائپوریؒ خلیفہ اجل حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری، قدس سرہ، جنھوں نے بزمانہ قیام دہلی، مدرسہ امینیہ میں علامہ سے اور کتابوں کے علاوہ ترمذی شریف بھی پڑھی تھی، فرماتے کہ "میں تو غیر مقلد ہوا چاہتا تھا، مگر حضرت شاہ صاحبؒ کے درس ترمذی سے مقلد بھی ہوا اور حنفیت میں متصلب بھی، اور یہ کسی ایک شاگرد کا نہیں، بلکہ مشہور عالم، شافعی المسلک، اساسی شخصیتیں، بھی یہی تاثر پیش کرتیں، چنانچہ المنار مجلۃ کے مدیر شہیر، اور تفسیر المنار کے مولف، علامہ رشید رضا صاحب المصری، جب دیوبند تشریف فرما ہوئے، تو استقبالیہ تقریر عربی میں از جانب اہتمام علامہ کشمیریؒ کے سپرد کی گئی رہائش گاہ سے چلتے ہوئے کسی طالب علم نے علامہ سے عرض کیا کہ مصری علامہ فرمارہے تھے کہ علمائے دیوبند حدیث کو حنفی بنانے میں دسترس رکھتے ہیں، یہ تبصرہ سن کر کشمیری الامام نے فوراً فیصلہ کیا کہ علامہ رشید رضا کی اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہیئے، چنانچہ ابتدائی استقبالیہ کلمات ارشاد فرما کر علمائے دیوبند کا مسلک انکا علمی ذوق، حدیث وفقہ میں رابطہ، حنفیت کی اصابت، احناف کے مضبوط دلائل، اس تفصیل، اور بلند پایہ انداز میں ارشاد فرمائے کہ رشید رضا، جو کرسی پر جلوہ افروز تھے، بار بار کھڑے ہوتے اور فرماتے " واللہ مارأیت مثل ہذا العالم الجلیل قط" اور اپنی جوابی تقریر میں فرمایا کہ اگر حنفیت وہی ہے جو حضرت علامہ کشمیریؒ نے پیش فرمائی تو میں کہتا ہوں کہ یہ کافی وافی اور شافی ہے" مختص تلامذہ کی املائی تقاریر "عرف الشذی" "انوار المحمود"

فیض الباری" "انوار الباری جو بار ہا طبع ہوتی رہیں' اور ہو رہی ہیں' کی ایک ایک سطر بتاتی ہے کہ یہ سارا سرمایہ حنفی مسلک و موقف کو مدلل کرنے کا شاہد عدل ہے خصوصاً عرف الشذی میں اپنے مقاصد کے ثبوت واثبات کیلئے جس کثرت سے وہ کتنی حوالے پیش کرتے ہیں" اس سے انکا تبحر' وسعتِ معلومات' وقعتِ نظری' اعتدال وانصاف' نمایاں ہے' اور ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے' کہ حنفیت کی تائید میں ژرف نگاہی کے مرغزار' مہیا کردیئے گئے' انہوں نے بعض مواقع پر حنفیت کے مؤیدات ایسے نادر و نایاب جمع کیے جو حافظ ابن ہمامؒ' ابن نجیمؒ' اور زیلعیؒ کے بھی ہاتھ نہ لگے تھے' مگر یہ دنیا' دار العجائب ہے' جسکے پاس وسائل موجود ہیں وہ حقائق کو توڑنے مروڑنے میں چابک دستیاں دکھاسکتا ہے' چنانچہ سب ہی جانتے ہیں کہ قادیانیت کے قلع وقمع میں "علامہ نے جو کردار پیش کیا وہ تاریخی اور مثالی ہے' قادیانیوں کے کفر کا فیصلہ پوری قوت سے انہوں نے کیا' بھاؤلپور کی عدالت میں جج سے یہ ہی انکا مطالبہ تھا' اپنے تمام' مستعد تلامذہ کو استیصال قادیانیت کے محاذ پر لاکھڑا کیا' پنجاب میں مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے آتش بار مقررین سے قادیانت کو در گور کرنے کی سعی کی' خود عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام' لکھی' خاتمہ عمر پر خاتم النبیین' بزبان فارسی قلمبند کی' جس میں رسول اکرم ﷺ کی ختمِ نبوت پر دقیق علمی دلائل کا انبار لگادیا' مگر ہو یہ رہا ہے کہ ایک مشہور بزرگ کے کسی فتوئ پر دستخط جو انکی متعارف دستخط بھی نہیں ہے' قادیانیت کی بیخ کنی میں مساعی کا تاج زرین انہی بزرگ کے زیب سر کیا جارہا ہے' فیا اسفی!

حد تو یہ ہے کہ پاکستان سے شائع ہونیوالے تحفظ ختم نبوت" نامی رسالے کے سرورق پر' بیادگار خطیب العصر عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام نامی اور انکے ساتھ ایک فہرست موجود ہے لیکن اس معمار اول کو فراموش کردیا گیا' جس نے عطاء اللہ شاہ بخاری کو اس محاذ کے لئے امیر شریعت بنایا تھا' ان چیرہ دستیوں کی داستاں کہاں تک سنائی جائے!

تفصیل اب دوسرے زمرہ کی پیش کرنا ہے' یعنی حنفیت کی تائید کیلئے انکے قلمی مسودات' مطبوعہ وغیر مطبوعہ فصل الخطاب' قرآۃ خلف الامام پر انکی معرکۃ الآراء تالیف ہے' نیل الفرقدین رفعِ یدین کے اختلافی مسئلے پر مسکت ہونے کے ساتھ علم و معلومات سے لبریز ہے' کشف الستر' صلاۃ وتر سے متعلق ہے' یہ وہ تالیف ہے جو ان کے محقق معاصر علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ سابق صدر الاھتمام دار لعلوم دیوبند کے اس اعتراف کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے' کہ میں نے کئی بار کشف الستر کا من وعن مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ حضرتِ علامہ کشمیریؒ نے اپنی اس تالیف میں کس تحقیقی کاوش' باریک بینی' اور ژرف نگاہی کا منظر پیش کیا ہے' سب سے اہم ذخیرہ آثار السنن مؤلفہ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی' پر انکا مکمل حاشیہ ہے' مولانا نیمویؒ

نے فقہ حنفی کے دلائل اپنی اس تالیف میں ذخیرہ حدیث سے پیش کیے' جو حضرت شیخ الہند علیہ رحمۃ کی وساطت سے علامہ کشمیریؒ کو پہونچا' شوقؒ نیموی کی گراں مایہ خدمت کا اعتراف تو ان اشعار سے واضح ہے جو علامہ نے ارتجالا فرمائے اور اس مسودہ کے ساتھ موجود ہیں مولانا شوقؒ سے جو دلائل حدیثی ذخیرے میں رہ گئے تھے

"کشمیری الامام نے انکو بصورتِ حواشی درج فرمایا' غالبا ایک ہزار سے زائد کتابوں کے حوالے بقیدِ صفحات وسطور اس مسودہ میں موجود ہیں کہ مطبوعہ کتب کا نام صفحہ تحریر فرمایا' اور غیر مطبوعہ قلمی کتب کی عبارتیں نقل فرمادیں' جو انہی کے قلم مبارک سے لکھی گئیں' انکے باختصاص شاگرد' الحاج مولانا محمد میاں سملکیؒ نے تقریباً پچاس سال پہلے لندن میں اسکے چند فوٹو لئے اور ہندوستان کی علمی شخصیتوں کے ساتھ ساتھ' دنیا کے مشہور کتب خانوں کی علمی امانت بنادیا' مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے چند صفحات میں اسپر ابتدائیہ لکھا' آج اگر اسکے حوالوں کی تخریج کرلی جائے تو چند جلدوں میں اسکی تکمیل ہوگی' اور فقہ حنفی کا یہ سب سے مضبوط و ناقابل تسخیر قلعہ منظر عام پر آئیگا' مگر اب تو انکے وہ محقق شاگرد دنیائے دون کو چھوڑ چکے' جو اپنے استاذ کے علوم کے امین' انکے ذوق سے واقف' اور انکے علمی وثائق کے ترجمان تھے متاخرین میں' کم از کم مجھ بے بضاعت کو تو کوئی ایسی علمی شخصیت نظر نہیں آتی' جو اس علمی خزانہ کو افادۂ عام کی راہوں پر ڈال سکے' مصیبت بالائے مصیبت۔

علامہ مرحوم نے یہ قیمتی اور علمی اثاثہ غالباً اس تصور کے تحت قلمبند کیا کہ اس سے استفادہ کرنے والا بھی انور شاہ ہوگا' چند سال گذرتے ہیں مولانا عبدالرحمان میاں سملکیؒ ثم افریقی' ہندوستان' پھر پاکستان پہونچے' اور آثار السنن پر کام کیلئے' مولانا مفتی محمد یوسف صاحب لدھیانوی مدیر بینات کراچی' کی سیادت میں اہل علم کی کمیٹی قائم کی ایک ڈیڑھ سال بعد خاکسار کی کراچی میں مولانا لدھیانوی سے ملاقات کے دوران جب آثار السنن پر کام کی نوعیت معلوم کرنے کی گفتگو ہوئی تو موصوف نے بتایا کہ ھنوز حضرتِ شاہ صاحب کے پیش کردہ حوالوں کی فہرست بھی مرتب نہیں ہوئی' اور یہ بھی کہا کہ اس خدت کو وہی انجام دے سکے گا' جو علامہ کے پیکر ان علوم کا ذائقہ شناس ہو! آہ!

حضرت علامہ کی پوری زندگی کا یہ حاصل اور مویداتِ حنفیت کا بے بہا سرمایہ "مردے از غیب بروں آید و کارے کند" کا منتظر ہے' یہ بھی عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ امام کشمیری نے بسم اللہ کی "ب" سے لیکر "تا" تائے تمت' محققین اور اور ائمہ فنون سے اختلاف کیا جیسا کہ لکھ بھی آیا ہوں کہ وہ باستثناء فقہ ہر فن پر خود اپنی رائے رکھتے' بطور لطیفہ' صورت واقعہ سامنے لانے کیلئے عرض ہے' کہ "الرحمان"

الرحیم'' میں ''رحمت'' سے متعلق اہل علم' ان کاوشوں پر مطلع ہیں' کہ ''رحمت'' میں انفعال ہے اور خدا تعالیٰ منفعل نہیں' قاضی بیضاویؒ نے گھبرا کر راہ یہ نکالی' کہ ''رحمت'' کی نسبت' خدا تعالیٰ کی جانب ''مجازی'' قرار دیدی' کشمیری علام نے اسے نقل کر کے فرمایا'' میں نے کہا کہ اگر رحمت کی نسبت خدا تعالیٰ کی جانب بھی مجازی ہوگی تو پھر حقیقی نسبت کس کی طرف ہوگی''۔

اس سے معلوم ہوگا کہ وہ کسی بھی کوہ پیکر شخصیت کی کاوش کو محض اسکے بھاری بھر کم نام کیوجہ سے قبول نہ فرماتے' تاوقتیکہ خود انکا فکر و نظر اور علم فن اسے قبول نہ کرے' اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ متقدمین کی علمی کاوشوں پر انکی تحقیقی نظر تھی' مطبوعات' و مخطوطات کا وافر ذخیرہ اپنے دماغ میں انڈیل چکے تھے' اور خداداد حافظے کی بنا پر سب پڑھا لکھا' انکے لئے کف دست تھا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نام علمی صفوں کو تھرا دینے والا ہے' لیکن ایک دن سبق میں فرمایا کہ شیخ کی تمام مطبوعات و مخطوطات میری نظر میں ہیں' افسوس کے انکے یہاں مجھے ایک چیز بھی ایسی نہ ملی' جو میں پہلے سے نہ جانتا ہوں' دورانِ مطالعہ اگر مجھے ایک چیز بھی نئی ہاتھ لگ جاتی ہے' تو میں اپنی طویل عرق ریزی کو بیکار نہیں سمجھتا' پھر طبیعت میں اعتدال وانصاف' کھوٹے وکھرے کی تمیز' پھولوں کی واقعی شمیم انگیزیاں' اور مصنوعی گلوں کی بے حاصلی' کی وافر صلاحیتوں سے بہرہ مند ہونے کی بناء پر' جو کچھ فرماتے وہ ٹکسالی ہوتا' اور ہر طرح کافی وشافی' ان کی املائی تقریروں سے انکے بے کراں علم تک رسائی ممکن نہیں' اگرچہ اصل موضوع سے متعلقہ' تفصیل تو ختم ہوئی' تاہم میں'' دو چار مثالوں سے فقہی مسائل میں انکے غور و فکر کا منہاج' واضح کرنا چاہتا ہوں مثلاً عورت بغیر محرم کیا سفر حج کر سکتی ہے؟ مسئلہ الجھا ہوا ہے' اور مختلف آراء کا مجموعہ' مولانا مفتی محمد سہول صاحب' بھاگلپوری' دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں ''مفتی'' کی حیثیت سے تھے' اسی مسئلہ میں علامہ سے رجوع کیا مفتی صاحب کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ ''اپنے لئے پوچھتے ہو! یا فتنہ کیلئے ''مطمئن کرنے پر فرمایا کہ ''جب ثقہ عورتیں ساتھ ہوں' اور فتنہ سے امن ہو' تو میرے نزدیک بغیر محرم سفر حج کر سکتی ہے' میں تمام اسفار میں عورت کا سفر فتنہ وعدم فتنہ پر دائر کرتا ہوں' ''کہتا ہوں کہ حنفی مذہب کی بھی یہ ہی تحقیق ہے' اگرچہ کسی نے اسکی صراحت نہیں کی علماء نے سفر حج کے مسئلہ کو ان احادیث کے تحت کر دیا جو عام اسفار کی ممانعت سے تعلق رکھتیں۔

امام بخاریؒ نے بھی ایسا ہی کیا مگر میرے نزدیک یہ صحیح نہیں' امام ترمذیؒ' ممانعت سفر کی حدیث لاتسافر المرء ''ابواب الرضاع'' میں لائے ہیں' ''کتاب الحج'' میں ذکر نہیں کیا جبکہ بخاریؒ نے اس حدیث کو ''ابواب سفر'' اور ''کتاب الحج'' دونوں میں ذکر کیا' امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ نے اس حدیث ممانعتِ

سفر کو حج کے سفر پر اثر انداز نہیں سمجھا اور غالباً ان محدثین نے بھی جو اس حدیث ممانعت کو تحت "کتاب الحج" ذکر کر رہے ہیں، مالکؒ احمدؒ اور امام شافعی الامامؒ نے حج تطوع، اور عام اسفار پر محمول کیا ہے، اس سے میں سمجھتا ہوں کہ امام اعظمؒ کا مسلک بھی یہ ہوگا، میں نے احادیث ممانعت سفر بلا محرم کو، حج فرض سے غیر متعلق قرار دیا، اور ابواب حج کے تحت ان احادیث کے ذکر کو بے محل سمجھا، میرے پاس ایسی احادیث کثیرہ کا ذخیرہ ہے، جن سے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ احادیث، ممانعتِ سفر کا تعلق، سفر فرض حج سے نہیں ہے، اور مدار مسئلہ فتنہ وعدم فتنہ ہے!

آنحضور ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص کو مکہ معظمہ بھیجا کہ وہ حضرتِ زینبؓ کو کسی کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیں، زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ سفر غیر محرم کے ساتھ ہوا، اور جبکہ مالکؒ وشافعی اور احمدؒ بحالت امن عن الفتنہ "ثقہ عورتوں کیساتھ" سفر حج فرض کی اجازت دیتے ہیں، تو میں یقین کرتا ہوں، کہ ابو حنیفہؒ کا بھی یہ ہی مسلک ہوگا، اگرچہ وہ منقول نہیں ہوا۔

مالک نے مؤطا میں ولتحرج فی جماعۃ من النساء کے تحت لکھا کہ "جس عورت نے حج فرض ادا نہ کیا ہو! اور محرم میسر نہ ہو، تو ثقہ عورتوں کے ساتھ حج کرلے، اور خدا کا فرض ترک نہ کرے" امام شافعیؒ کی بھی ایسی وضاحت ہے، اور احمد ابن حنبلؒ کی بھی اسلئے! میں کہتا ہوں کہ "سفر حج برائے ادائیگی فرض، سب کے یہاں متفقہ ہے!

مفتی سہول صاحب نے وعدہ کے باجود حضرتِ شیخ الہند سے کشمیری الامام کی رائے ظاہر کی تو سکوت فرمایا، ویسے عام طور پر بھی، حضرت شیخ الہند فرماتے "شاہ صاحب جو کچھ فرماتے ہیں مفید فرماتے ہیں" اور اپنے اس نامور شاگرد کی تحقیقات کو بڑے انہماک سے سنتے، مراد آباد کے ایک سفر میں، "جسمیں حضرت شیخ الہند کے ہمراہ علامہؒ بھی تھے، کسی نے حضرتِ شیخ الہندؒ سے مسئلہ تقدیر دریافت فرمایا" "فرمایا کہ مولوی انور شاہ صاحب سے پوچھو" حضرت کا اشارہ پاکر، علامہ کشمیریؒ نے شرح وبسط سے مسئلہ واضح کیا، حضرت گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی اس گفتگو کو اس محویت سے سن رہے تھے کہ ہیئت تک نہیں بدلی اور بعد میں شرکاء مجلس سے فرمایا کہ "جوبات شاہ صاحب" فرماتے ہیں مفید فرماتے ہیں۔

ھاشمی کو زکوٰۃ لینے کا مسئلہ

معرکۃ الاراء اور فقہاء اربعہ میں زیر بحث رہا، رسول اکرم ﷺ کا بخاری ومسلم میں ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد بذیل واقعہ حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہ کہ انھوں نے صدقہ کے ڈھیر سے کھجور اٹھالی اور دہن مبارک میں ڈالی اس پر کائنات کے مقدس ترین نانا ﷺ کی تنبیہ، اور اسکے علاوہ دوسری احادیث

بسلسلہ ممانعت زیر گفتگو رہیں، عام فقہاء کی رائے یہ ہیکہ زکوۃ وصدقات بشرطیکہ واجبہ ہوں، صدقہ فطر اور کفارات کے درجے میں ہیں، جن کا لینا بنوہاشم کیلئے جائز نہیں، طحاویؒ نے بحث کرتے ہوئے ابن عباسؓ کی ایک روایت کی روشنی میں، صدقات کو بنوہاشم پر صرف کرنے کی اباحت پیش کی ہے، امام اعظمؒ کا خیال یہ ہے کہ جملہ صدقات واجبہ وغیر واجبہ بنوہاشم کو دئے جا سکتے ہیں، اور یہ بھی ان سے منقول ہے کہ ہاشمی، ہاشمی کو دے سکتا ہے، مگر کچھ ارباب علم اسے قاضی ابویوسفؒ کی رائے بتاتے ہیں لیکن طحاویؒ الامام، مصر ہیں کہ یہ رائے ابو حنیفہ الامام کی ہے۔

"الامام کشمیری کی بھی یہ ہی رائے ہے، مگر انکے خیال میں بنیاد قطعاً دوسری ہے، وہ فرماتے ہیں کہ " اگر بنوہاشم میں سے کوئی غربت وافلاس کی بناء پر بھیک مانگنے پر مجبور ہو، تو "سوال" کی ذلت سے بچانے کیلئے صدقہ اور زکوۃ اسکو دی جا سکتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے، عام احناف کے مقابل، جواز کی جانب تو وہ گئے، لیکن بنیاد اپنے طور پر منقح کی ویسے تو مسائل بکثرت ہیں جسمیں علامہ رحمتہ اللہ علیہ کی تحقیق و تفتیش پیش کی جا سکتی ہے، جو اسکے شواہد ہیں، کہ فقہ میں بھی انکی بالغ النظری منفرد ہے، لیکن طوالت کا خوف، " عناں گیر ہے، تاہم موضوع سے متعلق جستہ جستہ جو چیزیں پیش کیں ان سے معلوم ہوگا، کہ طحاویؒ الامام کے بعد حنفی فقہ کی تائید میں علامہ مرحوم کی خدمات کس قدر وقیع و پروقار ہیں، کیا عجب ہے کہ خدا تعالیٰ اس ناقص تحریر کو مقصد کی تفہیم کیلئے تاریک راہوں میں روشن چراغ کر دے

"وما ذالك على الله بعزيز"

☆☆☆

بدرالحسن قاسمی
(کویت)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

صاحبِ بصیرت عالم دین اور بلند پایہ مفکر

۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء کا دن اس لحاظ سے بڑا ہی المناک ثابت ہوا کہ اس دن عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت نامور مصنف، مشہور صاحب قلم اور بابصیرت عالم دین، بلند پایہ مفکر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا اور جن کے جانے سے عرب وعجم میں یکساں طور پر صفِ ماتم بچھ گئی اور ہر ایک نے ان کے اُٹھ جانے کو امت کے لئے ایک زبردست خسارہ سمجھا۔

زندگی کے ساتھ موت تو لگی ہوتی ہے ہی لیکن ایسی زندگی جس نے "دعوت وعزیمت" کی تاریخ لکھی ہو مسلمانوں کے عروج وزوال کا فلسفہ بیان کیا ہو، "پرانے چراغ" روشن کیے ہوں "ایمان ومادیت کا معرکہ" سر کیا ہو۔ عربوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی ہو۔ مغربی تہذیب پر پُر زور تنقیدیں کی ہوں، اخلاقی قدروں کو بحال کرنے کے لئے ہر طرح کے جتن کیے ہوں۔ ادب کو اسلامی موڑ دینے کی کوشش کی ہو اور انسانیت کا پیغام عام کرنے کے لئے مُردہ دلوں میں صور پھونکنے کی کوشش کی ہو ایسی زندگی کا اس طرح اچانک خاتمہ یقیناً المناک ہے ایک زبرست سانحہ ہے ایک ایسا واقعہ ہے جس سے بہت سی آنکھیں بجا طور پر اشکبار ہوگئیں۔

مصائب اور تھے پر ان کا جانا
عجب ایک سانحہ سا ہوگیا ہے

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ایک ایسے گھر میں آنکھیں کھولی تھیں جو علمی ودینی حیثیت سے امتیاز رکھتا تھا۔ اور بچپن سے انھیں ایسا ماحول میسر آیا جس نے ان کی شخصیت کی آبیاری کی۔ عربی زبان وادب میں امتیاز کے لئے خالص عرب اساتذہ ملے اپنے ذوق اور منشاء کے مطابق علم کے حصول کیلئے مناسب ماحول ملا۔ خلیل عرب اور تقی الدین الھلالی المراکشیؒ عربی زبان وادب کا ذوق پیدا کرنے میں معاون ہوئے تو مولانا حیدر حسن خانؒ ٹونکی اور مولانا حسین احمد مدنیؒ سے علم حدیث کے حصول میں مدد ملی، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے قرآن فہمی کا موقع ملا اور عربی کے ساتھ اردو ادب میں ذوق ومہارت کے مقام تک پہنچنے کے لئے گل رعنا

کے مصنف کی علمی وادبی وراثت بھی کام آئی اور ملک کے ادبی ماحول نے مہمیز کیا پھر ان سب سے بڑھ کر وہ زریں عصر جس میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ، ظفر علی خاں، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ جیسے یکتائے روزگار مصنفین، مقررین، اُدباء اور شعراء سے برصغیر کا چپہ چپہ جگمگا رہا ہو اور عرب دنیا میں امیر شکیب ارسلان، رشید رضا، عباس محمود العقاد، احمد حسین الزیات، مصطفیٰ صادق الرافعی، مصطفیٰ المنفلوطی، زکی المبارک، طٰہٰ حسین، امین، عبدالقادر المازنی، محمود شاکر جیسے اربابِ قلم اور اربابِ فکر و نظر اپنی نگارشات اور اپنے افکار سے دنیا کو معمور کئے ہوئے ہوں، ایسے ماحول میں صلاحیتوں کا نکھرنا اور کودن کا کندن بن جانا بھی حیرت انگیز نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ایک فطری صلاحیتوں سے بہرہ ور اور اچھے اور صالح ماحول میں پروان چڑھنے والے نوجوان نے نام پیدا کیا ہو۔ یہ بات مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خوش بختی کہی جائے گی کہ بچپن سے انھیں ایسا ماحول میسر رہا کہ وہ فکر و نظر کے انتشار سے محفوظ رہے اور ان کے قلم کی طاقت پر روز اول سے مقصدیت غالب رہی چنانچہ وہ دنیا کے بہت سے دوسرے اُدباء اور ارباب قلم کی طرح فکری بے اعتدالی میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے اور ان کے قلم کی پاکیزگی ہمیشہ برقرار رہی۔

ان کے قلم سے انتہائی کم عمری میں "سیرت سید احمد شہیدؒ" جیسی کتاب سامنے آئی جو محققانہ بھی ہے اور تصنیفی خصوصیات سے بھرپور بھی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کیلئے گھر اور خاندان کے علمی و دینی ماحول کیساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسے ایک مرکزی ادارہ کی وراثت بھی فراغت اور یکسوئی کے ساتھ تقدیر الٰہی اور پھر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنی شخصیت کو نکھارنے، سنوارنے اور بنانے میں معاون ثابت ہوئی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو بچپن سے یہ سعادت اور توفیق بھی حاصل رہی ہے کہ انہوں نے اردو اور عربی دونوں زبانوں میں اپنے وقت کے نامور اور باکمال مصنفین جیسی صلاحیتوں کے حصول کیلئے پہلے تو ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، لکھنو یونیورسٹی، لاہور میں مولانا احمد علی کا حلقہ درس ملک اور بیرون ملک کے ادبی اور صحافتی و تصنیفی و تالیفی مراکز اہل دل کے حلقے اور رائے پور، سہارنپور، بھوپال کی خانقاہیں۔ ہر خرمن سے تنکے اکٹھا کرنے اور ہر باغ سے پھول چننے کا طریقہ اپنایا۔ جس نے ان میں ایسی ذاتی اور شخصی خوبیاں اور کمالات اکٹھا کر دئے جن کا حاصل کرنا ہر شخص کیلئے آسان نہیں ہوتا پھر انہوں نے سوچ سمجھ کر اپنی صلاحیتوں کا ایک خاص رُخ متعین کر لیا اور ساری زندگی بجائے دارالمصنفین یا کسی ملکی یا غیر ملکی تحقیقی ادارے سے وابستہ ہو کر علم و تحقیق کی داد دینے اور ادبی و علمی موضوعات پر تصنیفات کا انبار لگانے کے انہوں

نے دعوتی و تبلیغی راہ اختیار کی اور اپنے آپ کو ہر طرح کی ملازمتوں کی گرانباری سے آزاد رکھ کر دین وملت کی خدمت میں لگ گئے اور اصلاحی زندگی اور اس کیلئے اپنی قلمی صلاحیتوں کو استعمال کیا اور خاص طور پر عربوں سے خطاب کو اپنا مشن بنالیا۔ اپنے زمانہ کی دینی تحریکوں کا انہوں نے گہرائی سے جائزہ لیا تھا۔ جماعت اسلامی کے توبانیوں اور مؤسسوں میں ان کا نام آتا ہے لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی راہ مودودی صاحب سے الگ کرلی۔ انہیں سکون نظام الدین کی تبلیغی جماعت اور اس کے نامور بانی مولانا الیاس کاندھلویؒ صاحب کے پاس ملا۔ چنانچہ اس سے وابستہ ہو کر انہوں نے عرب دنیا کا طویل سفر بھی کیا لیکن اس میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی اور ہمدردانہ جذبات' خیر خواہانہ تاثرات بلکہ عملی مشارکتوں کے باوجود تبلیغ کا باقاعدہ جزنہ بن سکے جس کی داستان انہوں نے خود ہی ''کاروانِ زندگی'' میں قلمبند کردی ہے اور تبلیغ کے نِصاب و نظام میں تھوڑی ترمیم اور بہت کچھ اضافہ کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔

عربوں میں برپا ہونے والی سب سے مؤثر اور بڑی تحریک ''الاخوان المسلمون'' کو بھی انہوں نے قریب سے دیکھا اس کے ساتھ فکری ہم آہنگی محسوس کی اور اس کے بانی ''شیخ حسن البنا'' سے گوکہ ان کی ملاقات نہیں ہوسکی تھی لیکن ان کے طرز دعوت، طرز فکر، مؤثر شخصیت، داعیانہ کمالات کا دل کھول کر اعتراف کیا بلکہ مشہور اخوانی مفکرین و قائدین سے تاحیات قریبی روابط رکھے جن میں ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، شیخ محمد الغزالی، سید قطب، ڈاکٹر سعید رمضان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ عربوں میں مولانا کی کتابوں کو عام کرنے میں اخوان کی تحریک کو بڑا دخل ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی سب سے اہم اور بنیادی کتاب ''مَاذَاخسِرَ العَالَمُ بِانحِطَاطِ المُسلِمِینَ'' یا ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کا پہلا ایڈیشن جو نامور ادیب احمد امین کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا اس کا اب کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ کتاب کا وہی ایڈیشن ذریعہ تعارف بنا جس پر مشہور اخوانی لیڈر سید قطب شہید کا انتہائی مؤثر اور گرانقدر مقدمہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ظاہر ہوا کہ مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے ''اَلْاَخْوَانُ الْمُسْلِمُوْنَ'' کے حلقوں نے کتاب کو اپنے نصاب یا تربیتی کورس کے ایک جز کے طور پر ہاتھوں ہاتھ لیا عربوں کی اس بارے میں جماعتی حساسیت سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اچھی سے اچھی کتاب کو اگر جماعت کے بڑوں کی طرف سے سند قبول نہ ملے تو اُسے کبھی عمومی قبولیت نہیں ملتی اور بڑی آسانی سے جماعت کے زیر اثر رہنے والا حلقہ اُسے نظر انداز کر جاتا ہے اور اُسے چنداں در خود اعتناء نہیں سمجھتا۔

عام طور پر لوگوں کا عرب دنیا کا سفر چند دنوں یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہوتا ہے مولانا نے ایک طے شدہ اور باقاعدہ پروگرام کے تحت عرب دنیا کا ایسا سفر کیا جو سال بھر سے زیادہ جاری رہا اور اس کیلئے تعارفی

کارڈ کے طور پر اپنے چند رسائل اور اپنی مفید و مؤثر کتاب بھی ساتھ رکھی دور فیقِ سفر بھی ایسے رکھے جو ہر جگہ مناسب ماحول کی تیاری میں معاون ہوئے جس کی داستان مولانا نے خود ہی لکھ دی ہے۔ پھر سفر کا ہر لمحہ انہوں نے کارآمد اور مفید بنایا وہاں کے ماحول کو سمجھنے کے نقطہ نظر سے بھی اور آئندہ کیلئے ماحول ساز گار بنانے کیلئے بھی جس کی داستان ان کے سفرنامہ "مذکرات سائح فی الشرق العربی" یا شرق اوسط کی ڈائری میں پڑھی جاسکتی ہے۔

مولانا نے اس سفر کے بعد عربوں کو خطاب کرنے اور انہیں ان کا بھولا ہوا پیغام یاد دلانے کو اپنا مشن بنالیا اور سیکڑوں رسائل اور کتابچے، تقریریں اور پمفلٹ تیار کر ڈالے۔ مولانا ان خوش قسمت لوگوں میں سے بھی ہیں جنکی تقریر و تحریر کا غالباً کوئی حصہ اردو، عربی بلکہ انگریزی میں بھی شائع ہونے سے باقی نہ رہا اور اسکے ضروری وسائل انھیں مہیا رہے اور انھوں نے ایک ایک لفظ کو اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھنے کی سعی بلیغ فرمائی۔

مولانا نے کتابیں تو بہت سی لکھی ہیں لیکن سب کا محور و اساس ان کی کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" ہی ہے اسکے علاوہ انکی اچھی کتابوں میں "تاریخِ دعوت و عزیمت" "أرکان اربعہ" جو ایک خاص احساس کے تحت اور مؤثر اسلوب میں لکھی گئی ہے اور "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" کو قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے اندر انفرادیت لئے ہوئی ہیں اور ہر حلقہ میں ان کتابوں کی پذیرائی بھی ہے۔

ویسے تو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر "نبی رحمت" "شخصیات و تراجم پر مولانا عبد القادر رائے پوری مولانا فضل گنج مراد آبادیؒ، مولانا الیاس کاندھلویؒ مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سبھوں کی سوانح انہوں نے لکھی ہیں اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب "التذکیر بسورۃ الکھف" کے انداز کی معرکہ ایمان ومادیت، غلام احمد قادیانی کی تردید میں "قادیانیت" "تصوف و سلوک پر "حقیقت تصوف" اور دوسری بہت سی کتابیں انہوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ بزرگوں اور معاصرین کا تذکرہ "پرانے چراغ" بھی اپنے انداز کی مفید و مؤثر کتاب ہے اس کے علاوہ اپنی زندگی کی داستان "کاروانِ زندگی" بھی انہوں نے اتنی تفصیل سے مرتب کر دی ہے کہ آئندہ لکھنے والوں کیلئے زیادہ کدو کاوش کی ضرورت نہیں ہوگی انہوں نے خود ہی اس کا اظہار بھی کر دیا ہیکہ انکی زندگی پر کئی افراد ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالے تیار کر رہے ہیں انھیں اس کتاب سے مواد مل جائیگا۔

عربی میں نصاب کی کتاب کے طور پر ان کی کتابیں "مختارات" "قصص النبیین" اور "القراۃ الراشدہ" کو مختلف تعلیمی اداروں نے اپنے نصاب کا جز بنالیا ہے جس سے مصنف کی محنت وصول ہوگئی اور بعض عربی کے بلند پایہ اُدباء نے مختارات میں ان کے حُسن انتخاب کی داد دی ہے۔

ندوۃ العلماء جس کے وہ اپنے والد حکیم سید عبد الحی الحسنیؒ اور اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلیؒ کے بعد جائز وارث ہوئے تھے اس کا فروغ ان کی زندگی کا مطمح نظر تھا۔ ندوہ میں انہوں نے اس رنگ کو پروان

چڑھانے کی کوشش کی جو بانئ ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کا تھا چنانچہ ندوۃ کی فضاء کو تبدیل کرنے میں مولانا مکمل طور پر کامیاب رہے۔

موجودہ ندوہ کا نصاب، ندوہ کے اساتذہ، ندوہ کے طلباء کا رُخ اور رجحان اور ان کا تبلیغ ودعوت سے قرب واتصال مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی جدوجہد کا کرشمہ اور مولانا کی شخصیت کا پرتو ہے۔ جس سے خاص طور پر اس سمیت کا خاتمہ ہوگیا جو علامہ سید سلیمان ندوی کے زمانہ میں اور خود مولانا علی میاں صاحب کے ابتدائی زمانہ میں ہونے والی طلباء کی احتجاجی تحریکوں اور اسٹرائیکوں کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ افسوس کہ ہندوستان کے بعض مشہور دینی اداروں نے مولانا کی زندگی کے اس سبق آموز پہلو سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

مولانا مرحوم نے اپنی سوانح عمری "کاروانِ زندگی" کی دوسری اور تیسری جلد جب ازراہِ عنایت میرے پاس بھجوائی تھی تو پڑھنے کے بعد میں نے خط لکھا کہ دارالعلوم کی اسٹرائیک سے متعلق آپ کی تحریر ایک طرفہ معلوم ہوتی ہے حالانکہ قاری محمد طیب صاحب مرحوم نے اسٹرائیک کا وہی علاج کیا تھا جو اب سے پہلے ندوہ کے منتظمین کر چکے تھے۔ مولانا نے خط کے جواب میں جو عنایت نامہ مجھے ارسال کیا تھا اس میں یہ الفاظ تھے۔

"میں نے اپنی دانست میں پوری غیر جانبداری سے لکھنے کی کوشش کی تھی اس کے باوجود آپ کو یہ تاثر ہوا ہے اس لئے اپنی تحریر کو دوبارہ پڑھنے کی کوشش کرونگا"

اس مسئلے میں مولانا کی پالیسی سے اتفاق نہ ہونے کے باوجود مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ بات مولانا کی عظمت کی دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے ایک خُرد کی رائے کی تردید یا تکذیب کے بجائے خود اپنی لکھی ہوئی تحریر کو دوبارہ پڑھنے کے وعدہ کا اسلوب اختیار کیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی زندگی کے بعض دوسرے اصولوں کی طرح ایک اصول یہ بھی اپنا رکھا تھا کہ بحث ومباحثہ یا ردّ وقدح سے مکمل طور پر اجتناب کریں جس سے یقیناً ان کو نفع پہنچا اور وہ یکسوئی سے اپنے اصلاحی ودعوتی کاموں میں لگے رہے اور ان کے گریز کے انداز نے تنقید کرنیوالوں کے حوصلے خود ہی پست کر دئے اور ان کی شخصیت نزاعی نہ بن سکی۔

ایک جماعت جس کا شعار ہی "بدگمانی اور بدزبانی" اور جس کی روزی ہی ائمہ دین کی تنقیص وتوہین سے وابستہ ہے اس سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان جس نے اپنا مستقبل ہی اسی پیشہ کو اختیار کر کے محفوظ کیا ہے اس نے ایک ضخیم کتاب مولانا کے خلاف عربی میں لکھ ڈالی اور جب وہ مولانا کے سامنے پیش کی گئی تو مولاناؒ نے پوری صفائی سے یہ بات واضح کر دی کہ اگر اس طرح کی پچاس جلدیں بھی لکھی جائیں تو میں اس کی تردید میں ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا چنانچہ وہ کتاب آج تک منظر عام پر نہ آسکی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے زیادہ قرب کا موقع تو مجھے نہیں ملا لیکن جب بھی ملاقات ہوئی ان کی تواضع اور اخلاقی عظمت کا اثر طبیعت نے ضرور قبول کیا۔

دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے اجلاس کے دوران جب مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، قاضی زین العابدین سجادؒ کے علاوہ حضرت مولانا مرحوم نے بھی ایک سوال مجھ سے فرمایا جس کا تعلق امام ابن تیمیہؒ کی کتابوں اور ان کی شخصیت سے متعلق تھا میں نے جواب میں تھوڑی سی تفصیل کے بعد مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا ایک عربی کا جملہ نقل کیا تھا مولانا نے اس کے بعد جب کبھی دیکھا عزت افزائی فرمائی۔

مولانا محمد رضوان القاسمی کی معیت میں ایک دو دن کے لئے رائے بریلی حاضری ہوئی تو سراپا اخلاق و تواضع نظر آئے اور بڑی محبت اور کرم سے پیش آئے۔

حاضری تو ادب اسلامی کے پہلے سمینار میں بھی میں نے دی تھی جس میں عبد العزیز الرفاعی، فتحی عثمان اور دوسرے نامور لوگ شریک ہوئے تھے لیکن خاص طور پر رائے بریلی میں " مؤتمر الدعوة والدعاة" کے موقع پر جب کویت کی" الهيئة الخيرية الاسلامية العالميه" کے سربراہ شیخ یوسف جاسم الحجی نے اپنے نمائندہ کے طور پر بھیجا تھا تب بھی مولانا کی عظمت کا لازوال نقش قائم ہوا۔

کویت میں مولانا کی آمد دوسری خلیجی ریاستوں کے مقابلے میں کم ہی رہی حالانکہ ان کا نام" الهيئة الخيرية الاسلاميه العالميه" کے مستقل بانی ممبران میں تھا۔ اور انہوں نے "اسمعي يا زهرة الخليج" کے عنوان سے کویت کو خطاب کر کے ایک رسالہ بھی تالیف فرمایا تھا۔

ایک سفر تو مولانا کا" المجلس الوطني للثقافة والفنون والآداب" کی دعوت پر ہوا تھا اس میں مولانا نے بڑا مفید مقالہ پیش فرمایا تھا۔ جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے انسانیت پر عظیم احسانات کا نہایت مؤثر بیان ہے اور جو کتاب کی صورت میں بھی شائع ہو گیا ہے اور مولانا کی بہترین کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

اس سفر کے موقع پر ہوائی اڈہ پر مولانا سے ملاقات اس حال میں ہوئی کہ دعوت دینے والوں کا کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا اس بدنظمی کا بعد میں نوٹس بھی لیا گیا تھا۔ حضرت مولانا نے دیکھتے ہی" طلع البدر علينا" فرما کر گلے سے لگالیا۔ جس کی لذت فراموش نہیں کی جاسکتی۔

کویت کے قیام کے دوران خاص طور پر ہوٹل میں مولانا سید محمد رابع ندوی، سید ابراہیم الحسنی اور دوسرے رفقاء کی موجودگی میں مولانا کی طبیعت بڑی باغ و بہار رہتی تھی اور بہت سے واقعات لطائف اور تجربہ

مولانا کی مجلس کا حاصل ہوا کرتے تھے فجر کی نماز کے وقت کا ذکر آیا تو فرمانے لگے ہندوستان میں تو یہ حال ہے کہ امام صاحب فرماتے ہیں السلام علیکم ورحمتہ اللہ تو سورج کہتا ہے وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ۔ اسفار مطلوب ہے لیکن اس میں اتنا مبالغہ کہ طلوع شمس کا وقت قریب ہو جائے یقیناً احتیاط کے خلاف ہے۔

کھانے کی ایک مجلس میں میں نے عرض کیا کہ حضرت اقبالؔ کے شعر میں میں نے ترمیم کر دی ہے۔

نشان مرد مومن باتو گویم
چو "مرغ" آید تبسم برلب اوست

کہنے لگے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کیا مرغ بھی ایسی چیز ہو سکتی ہے جس کی اتنی اہمیت ہو۔ اصل شعر میں "مرگ" ہے بات صرف لطیفہ اور مزاح کی تھی۔

کویت کے ایک سفر میں مولانا کی ایک اہم اور مؤثر تقریر شیخ عبداللہ العقیل کے دیوانیہ میں ہوئی تھی جس میں "الاخوان المسلمون" سے وابستہ نوجوانوں اور دوسرے ارباب فکر و دعوت کی بڑی تعداد شریک تھی مولانا نے اپنے خطاب میں اخوان تحریک کے بانی شیخ حسن البنّاؒ کے بارے میں غیر معمولی توصیفی کلمات ارشاد فرمائے تھے اور اس تحریک کے اثرات کا ذکر فرمایا تھا۔

اسی طرح کی ایک نشست مشہور ہفت روزہ مجلّہ "المجتمع" کے ہال میں کویت کے نامور مخیّر شیخ عبداللہ علی المطوع نے ترتیب دی تھی جس میں حضرت مولانا مرحوم کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ النفیسی اور ڈاکٹر حامد الرفاعی بھی شریک تھے مولانا کی طبیعت اس روز بھی کافی شگفتہ تھی اور مجلس پر چھائے رہے انہوں نے بڑے اچھے انداز پر تصادم کا انداز چھوڑ کر دعوت کے لئے حکمت کا انداز اختیار کرنے پر زور دیا اور خاص طور پر مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے طریقہ کار کو پیش فرمایا کہ انہوں نے اپنی داعیانہ بصیرت اور حکمت و مومنانہ فراست سے اکبر کے برپا کردہ فتنہ "دینِ الٰہی" کو نہ صرف مٹایا بلکہ ایسا ماحول تیار کیا کہ اس کی تیسری پشت میں اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسا صالح اور نیک دل بادشاہ تخت و تاج کا مالک ہوا اور حکومت کا رُخ الحاد و دہریت سے اسلام اور تنفیذ شریعت کی طرف موڑ دیا اس لئے ہماری مہم ارباب مناصب کو خوفزدہ کرنے اور ان کی کرسیوں پہ قابض ہونے کی کوشش کے بجائے ان ارباب مناصب کے دلوں میں ایمان و یقین کو داخل کرنا اور اُنہیں دین و شریعت پہ کاربند کرنا ہونا چاہیے۔

مولانا سے ایک ملاقات ترکی ادبی سیمنار میں شرکت کیلئے جاتے ہوئے کویت ایرپورٹ کے ٹرانزٹ لاؤنج میں ہوئی تھی اور غالباً آخری ملاقات دبئی میں اس موقع پر ہوئی جب مولانا کو خصوصی طور پر دبئی کے ولی عہد کی طرف سے ایوارڈ کیلئے بلایا گیا تھا۔ مولانا کے چند خطوط بھی میرے پاس ہوں گے جو سیرت النبیؐ کے

ترجمہ کی تجویز اور بعض دوسرے استفسارات کے جواب میں ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی داستانِ حیات ایک پوری صدی کی داستان ہے اور مولانا کی اٹھان اور ان کے بناؤ اور شخصیت کی تعمیر میں "مکتب کی کرامت" سے زیادہ "فیضانِ نظر" کا دخل معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے خود ہی "کاروانِ زندگی" میں اپنی کامیابیوں کو ماں کی دعاؤں سے جوڑا ہے "کہ ان کے ہم زمانہ لوگوں میں ایک سے ایک باکمال صاحبِ علم اور علم و تحقیق میں فائق لوگ موجود تھے اور ان کو قدرت نے ذکاوت وذہانت اور عبقریت سے بھی نوازا تھا لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جیسی شہرت و مقبولیت ان کو نہ مل سکی۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

مولانا کی زندگی کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ اپنی ہر طرح کی عزت، شہرت، ناموری اور مقبولیت کے باوجود انہوں نے اپنے زمانہ کے اہلِ دل بزرگوں سے رشتہ ہمیشہ قائم رکھا حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شاہ وصی اللہ فتحپوریؒ مولانا شاہ یعقوب مجددیؒ۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سبھی سے انہوں نے نیاز مندانہ تعلق قائم رکھا بلکہ بعد کے لوگوں میں اور اپنے سے کم عمر اہل صلاح کی بھی تعظیم کرتے تھے......

چنانچہ حضرت مولانا محمد صدیق باندویؒ، مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی کی بھی غیر معمولی عزت وتوقیر فرماتے رہے اور اپنے حلقہ کے لوگوں کو ان کی خدمت میں بھیجتے رہے۔ غالباً اس پہلو کا اثر بھی یہ ظاہر ہوا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے جتنا علم دیا تھا اس سے زیادہ توفیق اور برکت سے نوازا تھا چنانچہ وہ شہرت و وجاہت اور عالمی شخصیت ہونے کے لحاظ سے جس مقام پر پہنچے ان سے بھی زیادہ علم و فہم اور ذہانت وذکاوت رکھنے والے ان کے معاصر اور بعض ان سے بزرگ علماء کو بھی وہ مقام نہ مل سکا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ان کی موت بھی مبارک مہینہ مبارک دن اور مبارک ساعت میں اور اچھی حالت میں آئی جو حسن خاتمہ کی علامت ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ان کے صالح اعمال کو قبول فرمائے ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ کیوں کہ انہوں نے ساری زندگی اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے نام کی سربلندی کا نعرہ لگایا ہے۔ وَمَاذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

جناب محمد بہاء الدین ۔ یاقوت پورہ حیدرآباد۔

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کا قلمی سفر

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جیسے فلسفی، مفکر، مفسر قرآن، عالم دین، صاحب طرز انشاء پرداز، نامور ادیب وصحافی اور عظیم مصنف سے کون واقف نہیں، ان کے قلمی سفر پر روشنی ڈالنے سے قبل حضرت کے خاندانی حالات پر مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت کی پیدائش ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء میں قصبہ دریاباد کے ایک قدوائی خاندان میں ہوئی، لکھنؤ سے فیض آباد ریل سے جاتے ہوئے بارہ بنکی جنکشن ریلوے اسٹیشن کے بعد درمیانی نصف فاصلے پر اسٹیشن دریاباد ملتا ہے، اسٹیشن سے تین میل اندر کی طرف یہ قصبہ ہے، تقریباً چھ سو سال قبل ان اطراف کے کوئی حاکم دریا خان تھے، انہوں نے حضرت شاہ مخدوم محمد آکبشؒ خلیفہ ابوالفتح کانپوری کو ایک متصل قصبہ محمود آباد سے لاکر یہاں آباد کیا اور اپنے نام کی مناسبت سے قصبہ کا نام دریاباد رکھا، یہی بزرگ حضرت مولانا کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ حضرت مولانا کے دادا صاحب مفتی مظہر کریم تھے، ان کے بڑے بھائی حکیم نور کریم، جو حضرت مولانا کے نانا بھی تھے، دادا صاحب اپنے وقت کے بڑے فقیہ و عالم تھے، ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت شاہجہانپور کلکٹری میں سررشتہ دار تھے، الزام ان پر یہ لگا کہ باغی ان کے گھر پر جمع ہوکر منصوبے بناتے تھے۔ مقدمہ چلا اور ۱۸۵۹ء میں نو سال سزا عبور دریائے شور کی ہوئی، جیسا کہ اس وقت دوسرے علماء کو بھی ہوئی تھی، خوش اطواری پر ۱۸۶۵ء اکتوبر میں قبل از وقت رہا بھی ہوگئے، وفات ۱۸۷۳ء میں ہوئی، پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے تھے، بڑے عبدالرحیم اور چھوٹے عبدالقادر ان ہی چھوٹے صاحبزادے عبدالقادر کی چھوٹی اولاد ہمارے مولانا عبدالماجد دریابادی تھے، حضرت مولانا کے والد ماجد مولوی عبدالقادر کی پیدائش ۱۸۴۸ء میں ہوئی تھی، تعلیم عربی و فارسی کی اچھی خاصی پائی تھی، انگریزی بھی بقدر ضرورت پڑھ لی تھی، کسی انگریز حاکم کو اردو پڑھایا، اس نے خوش ہوکر عدالت میں سررشتہ دار بنا دیا، ترقی کرکے تحصیلدار، پھر ڈپٹی کلکٹر ہوگئے تھے، نکاح سگی چچازاد بی بی نصیر النساء سے ہوا، جو ہمارے حضرت مولانا کی والدہ ماجدہ تھیں، بڑی نیک، مخیر اور تہجد گزار خاتون تھیں، ایک لڑکی اور

دو لڑکے تھے، چھوٹے لڑکے ہمارے مولانا تھے، ۱۹۱۲ء میں والد ماجد نے حج کا ارادہ کیا، بیوی لڑکی وغیرہ کے چھوٹے سے قافلہ کے ساتھ حج کیا اور معاً بعد فرائض حج ۱۱ ریا ۱۲ ر ذی الحجہ کو ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۳ ر۱۴ ر کو عین فجر کے وقت اپنے خالق سے جا ملے، اس وقت مولانا اپنی عمر کے بیسویں سال میں تھے، اس کے بعد والدۂ محترمہ ۳۰ سال بقید حیات رہیں اور ۱۹۴۱ء میں ۸۳ سال کی عمر میں وفات پائیں اور دریا باد میں مسجد سے متصل قبرستان میں جگہ ملی۔ حضرت مولانا دریابادی کا وصال ۶ر جنوری ۱۹۷۷ء میں صبح صادق سے قبل خاتون منزل لکھنؤ میں ہوا، نماز جنازہ لکھنؤ میں حضرت مولانا علی میاں غفرلہ نے پڑھائی، پھر جنازہ دریاباد لے جایا گیا، جہاں محلہ کے ایک بزرگ حافظ غلام نبی مرحوم نے دوبارہ نماز جنازہ پڑھائی اور تدفین آبائی قبرستان احاطہ حضرت مخدوم آبکش میں ہوئی ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۔ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت مولانا دریابادی جیسی ہمہ پہلو شخصیت کے کارناموں پر قلم اٹھانا بڑا مشکل کام ہے، ایک ایک پہلو ایک ایک مقالہ بلکہ رسالہ چاہتا ہے، اس لئے یہ ہیچمداں حضرت کے تحریری پہلو پر "قلمی سفرنامہ" کے عنوان سے کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔

مختصر مضامین و مراسلوں کی ابتداء تو عمر کے بارہویں سال ہی سے شروع ہو گئی تھی، جب مولانا ساتویں درجہ میں تھے، اودھ اخبار لکھنؤ میں کسی فرضی نام سے لکھا کرتے تھے، سال بھر میں ایک کتاب ہی مرتب ہو گئی، یہ مضامین مختلف کتابوں کا حاصلِ مطالعہ ہوتے تھے، پھر آگے چل کر دیگر پرچوں "ریاض الاخبار" گورکھپور اور "اخبار الاسلام" امرتسر تک دائرہ وسیع ہوتا گیا، ۱۹۰۸ء میں کالج میں آئے تو مطالعہ میں وسعت آگئی۔ مختلف پرچوں کے ساتھ علی گڑھ منتھلی (آدھا اردو، آدھا انگریزی) اور ملک بھر کے دیگر رسالے اور اخبار رفاہِ عام لائبریری، ایڈوکیٹ لائبریری اور سب سے بڑھ کر کیننگ کالج لائبریری، سب کے دروازے کھلے ہوئے تھے، ۱۹۱۱ء میں جب سے امیر الدولہ پبلک لائبریری کھل گئی اس کے چکر تو متواتر اور کثرت سے لگنے لگے، مسلمانوں کا ایک سنجیدہ سہ روزہ امرتسر سے "وکیل" نامی نکلتا تھا، ۹-۱۹۰۸ء میں اس میں بھی دو لمبے مضامین لکھے، "محمود غزنوی" اور "غذائے انسانی" ان کو وکیل بک ایجنسی نے رسالوں کی صورت میں شائع کیا، جن کی بڑی دھوم رہی، یہ سب عمر کے سولہویں سترہویں سال میں ہو رہا تھا، یہی پہلی تصنیف تھی، جس کے سرِ ورق پر ادارے نے آپ کے نام کے ساتھ "مولانا" کے لفظ کا اضافہ

کیا تھا، وہ دو مضامین: (۱) "غذائے انسانی" جس میں گوشت خوری کو مطابق فطرت انسانی ثابت کرنے کے لئے مدلل جوابات دئے گئے تھے۔ (۲) "محمود غزنوی": سلطان محمود غزنوی پر کئے جانے والے متعصبانہ تاریخی اعتراضات کے مدلل جوابات، مولانا کے قلمی سفر کی بنیاد یہی دونوں مضامین تھے، جن سے آپ کی ہمت افزائی ہوئی، اور پھر اسپ قلم چل نکلا۔ ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ سے ایک نیا ماہنامہ "الناظر" جاری ہوا، اس میں مولانا شبلی کی الکلام پر "تنقیدی نظر" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جس کے اس وقت بڑے چرچے رہے، اس کے بعد "الناظر" سے مستقل تعلق قائم ہو گیا اور برسوں قائم رہا، اس میں مضامین کچھ فرضی، کچھ اصلی نام سے نکلتے رہے، الٰہ آباد سے ایک ادبی ماہنامہ "ادیب" نام کا بڑے آب و تاب کے ساتھ نکلتا تھا، ۱۹۱۲-۱۳ء میں اس میں بھی مضامین لکھے۔ "الندوہ" لکھنؤ، ایک اونچے معیار کا پرچہ تھا، ۱۹۱۳ء میں ایک مضمون انگریزی سے ترجمہ کر کے وہاں بھیجا اور مولانا نے اس کے مضمون نگاروں کی فہرست میں اپنا نام دیکھ لیا، مضمون نگاری کا سلسلہ اردو، انگریزی دونوں میں چلتا رہا "معارف" میں مضمون تو شروع ہی سے نکلنے لگے تھے، ۱۹۱۹ء میں اس سے باضابطہ ادارتی تعلق پیدا ہو گیا۔ جو غالباً ۱۹۲۳ء تک قائم رہا، مولانا محمد علی جوہر کے روزنامہ ہمدرد کی نگرانی ۱۹۲۰ء سے حضرت کے ذمہ رہی بلکہ گہرا ادبی تعلق تو شروع ہی یعنی ۱۹۲۴ء سے تھا۔

ان دنوں مضامین کے معاوضے بعض پرچوں نے دینا شروع کر دیا تھا، مولانا کا قلم اس زمانے میں خوب جولانی دکھلا رہا تھا، فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع اسی دور کی تصنیفات ہیں، فلسفۂ اجتماع کو بعد میں مولانا نے اپنی تصنیفات سے خارج کر دیا تھا (کیونکہ مولانا اس میں دینی ڈگر سے ہٹے ہوئے تھے) مشہور فلسفی برکلے کے مکالمات کا ترجمہ بھی اسی عہد کی یادگار ہے، جسے دارالمصنفین اعظم گڈھ نے شائع کر دیا تھا، لیکی کی ہسٹری آف یوروپین مارلس کا ترجمہ "تاریخ اخلاق یوروپ" دو جلدوں میں اور بکل کی ہسٹری آف سویلیزیشن ان انگلینڈ (تاریخ تمدن انگلستان) کی تین جلدوں میں سے بیشتر حصوں کا ترجمہ سب اسی عہد کی پیداوار ہیں، ۱۹۱۵ء میں ایک ڈرامہ "زود پشیمان" بھی لکھا، جو زیادہ شہرت نہ پا سکا۔

یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے اخیر جولائی ۱۹۱۸ء تک مولانا کا قیام حیدرآباد میں بھی رہا، جہاں دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے متعلق رہے، یہاں ایک خاصی ضخیم کتاب منطق پر تیار کر دی اور ایک کتاب

"تاریخِ یوروپ" کے ترجمہ کا تکملہ بھی کر دیا، یہ دونوں کتابیں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے سررشتہ تالیف و ترجمہ سے چھپی تھیں، ۱۹۱۸ء میں حضرت لکھنؤ تشریف لے جا چکے تھے، اس دور میں شعر و ادب کے علاوہ تمام تر مغربی فلسفہ کے ماہرین کے افکار زیر مطالعہ رہے، برطانوی فلسفی اسپنسر، مِل وغیرہ تو گویا نوکِ زبان تھے، ۱۹۱۸ء کے نصف آخر میں مطالعہ غیر مسلم فلسفہ و تصوف کا شروع ہوا، ہندو فلسفہ، بدھسٹ فلسفہ، چینی فلسفہ وغیرہ، سب انگریزی زبان میں۔ ماہنامہ "صبحِ امید" لکھنؤ میں اسی انداز کے کچھ مضامین لکھتے رہے۔ رفتہ رفتہ خیالات کی رو اسی جانب جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور مثنوی رومی کے مطالعہ نے ان خیالات پر مہر لگا دی، مولانا شبلی کی سیرۃ النبیؐ کی جلد اول بھی اس میں معین رہی، اب قلم کا رنگ ہی بدل گیا تھا، لیکن نفسیات مغربی کا غیر مضر اور صالح حصہ اب بھی قلم کا موضوع تھا "مبادئ فلسفہ" یا فلسفہ کی پہلی اور دوسری کتاب اور "ہم آپ" سب اسی رنگ کی نکلیں۔ حضرت اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر کی صحبتوں نے خیالات کا رخ بدلا، جس کا اثر قدرتاً قلم نے بھی قبول کیا، مولانا عبد الباری فرنگی محلی کا تاثر بھی ممد و معاون ہوا، پھر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے دستِ مبارک نے مولانا کا ہاتھ حضرت تھانویؒ کے دستِ حق رس تک پہنچا دیا اور اسی کو تھامے ہوئے حضرت مولانا نے اگلا سفر طے کیا، جیسا کہ ایک عارف باللہ نے فرمایا ؎

تنہا نہ چل سکو گے محبت کی راہ میں ٭ میں چل رہا ہوں آپ میرے ساتھ آئیے

مولانا کی تحریر کا مستقل کارنامہ تو خود ان کا ہفتہ وار اخبار تھا جو ۱۹۲۵ء میں "سچ" کے نام سے جاری ہوا، پھر "صدق" اور آخر میں "صدقِ جدید" کے نام سے نکلتا رہا، مولانا دریا بادی کے نام کے ساتھ "صدق" کا تصور لازمی ہے، بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "صدق" اور مولانا دریا بادی ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، ہزاروں لوگ مولانا کو اسی ہفتہ وار کی وجہ سے جاننے لگے تھے، اور پہلے تعارف کا ذریعہ "صدق" ہی ہوا کرتا تھا، یوں تو اس آٹھ صفحات والے ہفتہ وار کی ایک ایک سطر بڑی ہی قیمتی ہوا کرتی تھی، لیکن اس کے شذرات کی افادیت و انفرادیت تو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مماثل تھی اور اس کی "سچی باتیں" تو کلاہِ صدق ہوا کرتی تھیں، ہند و پاک کا کوئی معیاری پرچہ ایسا نہ تھا، جو ان شذرات اور سچی باتوں کو نقل کرنا اپنے لئے باعثِ فخر اور عوام کے لئے نفع بخش نہ سمجھتا ہو، اور یہ سلسلہ آج تک بھی جاری ہے، مولانا کے وصال کے بعد ان کے داماد و بھتیجے جناب

حکیم عبد القوی صاحب دریابادی (جو اس ہفتہ وار کے برسہا برس منیجر بھی رہ چکے تھے) اس کے معیار کو سنبھالتے ہوئے لشتم پشتم یہ پرچہ جاری رکھا، لیکن حکیم صاحب کی بعض انتظامی و مالی دشواریوں اور کمزوری صحت کے باعث یہ خورشید صحافت غروب ہوگیا، (انا للہ) اور صدق خواں حضرات نے باچشم نم اور دل پرغم اس گھاؤ کو برداشت کرلیا۔ اب چھ ماہ قبل مولانا کے ایک نواسے مولوی نعیم الرحمٰن ندوی نے "پیامِ سچ" کے نام سے قلم اٹھایا ہے، تو شمارے جاری ہوچکے ہیں، صدق کی نقل کی کوشش ہوئی ہے، خدا کرے کامیابی نصیب ہو۔

حضرت تھانویؒ کی ایما و ہدایت پر ہی تفسیر ماجدی پہلے انگریزی میں شروع کی، کئی انگریزی اور اردو تفاسیر، خصوصیت کے ساتھ حضرت تھانویؒ کی بیان القرآن سے رہنمائی اور حضرت تھانویؒ سے رہبری حاصل کی، توریت، انجیل اور اس سے متعلقہ لاتعداد محققین کی تفصیلات و تحقیقات پر غور و فکر کیا، سالہا سال کی محنتوں اور کاوشوں کے بعد یہ انگریزی تفسیر و ترجمہ تیار ہوا، ترجمہ بائبل قدیم کی انگریزی کا ہے، لیکن تفسیر ماڈرن انگریزی میں ہے، پہلے تاج کمپنی کراچی و لاہور کے زیر اہتمام سات منزلوں میں چھپا تھا، اس کا دوسرا ایڈیشن کامل نظر ثانی، معقول و معتدبہ اضافے کے ساتھ تیار ہوا، تاج کمپنی کراچی و لاہور نے برسہا برس تک اس کو ڈال رکھا، حتی کہ حضرت مولانا اپنی نظر ثانی شدہ تفسیر کو دیکھنے کی حسرت لئے ہی سفر آخرت اختیار کرگئے، واحسرتاہ! بقول حضرت مولانا کے: یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا، جس کا قلق انہیں آخری وقت تک رہا۔

اللہ تعالےٰ جزائے خیر عطا فرمائے حضرت مولانا علی میاںؒ (جن کے حکم اور دلچسپی سے) اور کارکنان مجلس تحقیقات و نشریات (خصوصاً مولوی عفران ندوی) کو، کہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی عرق ریزی اور جدوجہد کی، حضرت کی شکستہ تحریر کو پڑھنا کارے دارد تھا (حضرت خود کو بدخط لکھا کرتے تھے جو کثرتِ تحریر اور زود نویسی کا نتیجہ تھا) جب کہ ان کے کاتب خاص کا بھی انتقال ہوچکا تھا اور حکیم عبد القوی صاحب بھی اللہ کو پیارے ہوچکے تھے، ان تحریرات کو پڑھنے میں ان حضرات کو بڑا تعب اٹھانا پڑا، الحمد للہ اب وہ مرحلہ گزر چکا ہے، اور تین جلدیں چھپ چکی ہیں، ابھی کام جاری ہے، خدا کرے یہ کام جلد از جلد اختتام کو پہنچے۔

اب حضرت والا کی معرکۃ الآرا کتابوں کا سلسلہ چل نکلا تھا، یکے بعد دیگرے "حکیم الامت نقوش و تأثرات"، "محمد علی، ذاتی ڈائری"، "اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں"، ۱۹۲۹ء میں حج سے فراغت ہوئی تو "سفر حجاز" تیار ہوگئی اور بہت مقبول ہوئی، تصوف اسلام، فیہ ما فیہ، جغرافیہ قرآنی،

نباتاتِ قرآنی، حیواناتِ قرآنی، شخصیاتِ قرآنی، جدید قصص الانبیاء، مردوں کی مسیحائی، اور بہت سے چھوٹے رسالے اور کتابیں جو مولانا کے مضامین پر مشتمل ہیں شائع ہوتی رہیں۔

"سیاحتِ ماجدی" میں مولانا کے گیارہ سفروں کی تفصیلات بڑے دلچسپ اور اچھوتے انداز میں سپردِ قلم کی گئی ہیں۔

مولانا کا طرزِ تحریر ہی نرالا تھا، بڑے بڑے مضامین ایک جملے میں بیان فرما دیتے تھے، آخری ایام میں تو "آپ بیتی" بھی لکھ رکھی تھی، جس میں اپنی چھوٹی بڑی، دانستہ و نادانستہ ہر بات، غلطی اور لغزش کا اعتراف تھا، حضرت کے وصال کے بعد جب اس کی طباعت کا مرحلہ آیا تو سارے متعلقہ لوگ پریشان تھے کہ آیا اس کو من وعن چھاپ دیا جائے، یا چند باتوں کو حذف کیا جائے، اگر حذف کیا جائے تو کن باتوں کو، اس کی ذمہ داری کون لے؟ بہت سوچ بچار، رائے مشورہ، رکے و جھجک کے بعد بعض چیزوں کو حذف کرنا طے کیا گیا اور یہ سب ہمارے حضرت مولانا علی میاں کے مشورہ سے طے پایا، جو بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔

اپنی زندگی کے سارے واقعات اس قدر صاف صاف بطور آپ بیتی شاید ہی کسی نے لکھا ہو، یہ تو صرف "سچ" اور "صدق" کے ایڈیٹر ہی کا حق تھا، دوسروں کے بارے میں، بے لاگ سچ سچ اور بے جھجک لکھنے میں جو قلم کبھی بھی کسی مصلحت، مروت، خوف، طمع اور اندیشے میں رکا نہیں تھا تو خود کے بارے میں کیسے چوکتا؛

حضرت کی چھوٹی بڑی مطبوعات و مضامین کے مجموعوں وغیرہ کی تعداد ۶۵/۷۰ سے کم نہیں ہے اور یہ سب ان روزمرہ کے مضامین و شذرات و نشریے اور اخبارات وغیرہ کے علاوہ خود اپنے ہفتہ وار "صدق جدید" کا بہ پابندی اجرا، (جو تقریباً پورا ہی حضرت کے شذرات سے پر ہوتا تھا) مزید برآں تفسیر ماجدی پر نظر ثانی و ثالث کا سلسلہ تا حیات چلتا رہا۔

حضرت کے ہمہ پہلو مکتوبات کا ذخیرہ ان سب سے ہٹ کر رہا ہے، جس میں سے "مکتوبات دلدوز" اور "مکتوبات دل آویز" کی دو ضخیم جلدیں بھی چھپ کر آچکی ہیں، چند اہم اور دلچسپ خطوط راس خادم کے نام اور دیگر مشاہیر کے نام) مشتے از خروارے کے طور پر پیش ہیں، اللہ پاک حضرت مرحوم کی اس قلمی کاوش (جو دینی، ادبی، اصلاحی اور اخروی سدھار کے لئے تھی) کو قبول فرماتے ہوئے ان کے سفر آخرت میں

آسانی بہم پہنچائے اور اس قلمی سفر کو ذریعہ توشۂ آخرت بنائے، آمین، ثم آمین۔

مولانا دریابادیؒ - الحاد سے اسلام تک

مولانا دریابادیؒ کی ایمان وعقیدہ کی دنیا میں بار بار تبدیلیاں ہوئیں، بچپن اور شروع جوانی میں سخت مذہبی رہے، عمر کے تیرہویں سال سے اسلامیت میں ضعف پیدا ہونے لگا، انگریزی کتابوں کے مطالعہ نے برگشتہ کردیا، یہ کتابیں ایسی تھیں جن میں براہِ راست اسلام پر حملے کئے گئے تھے، اس کے علاوہ انگریزی کی ایسی کتابیں جو نفسیات سے متعلق تھیں زیر مطالعہ رہیں، تو ان کی وجہ سے وحی اور مذہب کے پرانے تصورات کی مخالفت کا خیال پیدا ہو گیا، اسراف، حظِ نفس، شہوت رانی وغیرہ کی حمایت کرکے ان کی تبلیغ اور ان کی حوصلہ افزائی کا حق ادا کردیا، برطانوی فلسفی اسپنسر، ہکسلے اور مِل وغیرہ تو گویا نوکِ زبان تھے۔

اس مطالعہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ طبیعت اسلام کی طرف سے برگشتہ ہوگئی اور نفس پر الحاد اور ارتداد کا جادو چل گیا، لندن کی ریشنلسٹ اسوسی ایشن کے ممبر بھی بن گئے اور اپنے آپ کو کھلم کھلا ریشنلسٹ (عقلیت پسند) یا اگناسٹک (لاادری) کہنے لگے، مگر اتنا غنیمت رہا کہ سوشیل حیثیت سے مسلمان رہے، اور مسلمانوں سے میل جول قائم رکھا۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک یعنی سترہویں سال سے ستائیسویں سال تک یہی اندازِ فکر اور یہی دورِ الحاد قائم رکھا، پھر اللہ کا فضل ہوا، ع کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے، مغرب کی ٹھیٹ مادیت پرستی کے خلاف رجحان پیدا ہوا اور روحانیت کی طرف کھنچاؤ شروع ہوا، دو سال کے اندر اندر ایمان اور اسلام کی طرف دوبارہ مراجعت شروع کردی اور ۱۹۲۰ء میں تو گویا پکے مسلمان بن گئے۔

صراطِ مستقیم کی طرف

مطالعہ سب سے پہلے چین کے مذہبی فلسفی کنفوشس کی تعلیمات سے شروع ہوا اور اس میں جی لگا، کنفوشس کی تعلیم اور جیسی بھی ہو، مادہ پرستانہ نہ تھی، غیب اور روحانیت سے کچھ نہ کچھ لگاؤ اسے بہرحال تھا، خالص مادی و مغربی نقطۂ نظر سے ہٹا ہوا یہ پہلا مطالعہ تھا، اس کے بعد شوق و تجسس و تحقیق کا قدم

اور آگے بڑھا، بدھ مت اور اس کے معًا بعد ہندو فلسفۂ تصوف ڈاکٹر بھگوان داس (بنارس کے درویش فلسفی) کی تصانیف سے پڑھا، پھر بھگوت گیتا کے انگریزی ترجمے پڑھ ڈالے، گاندھی جی کی بھی تحریریں اس دور (۱۹/۱۹۲۰ء) میں مادیت سے ہٹانے اور روحانیت کا معتقد بنانے میں معین رہیں، اس سارے مطالعہ کا مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگی مادی فلسفہ کا بت جو دل میں بیٹھا ہوا تھا از خود شکست و ریخت سے ہم کنار ہوتا چلا گیا۔

روحانیت کی یہ بہت بڑی فتح مادیت پر تھی اور سچ پوچھئے تو مولانا کو مغرب کے بے دین فلسفہ کے بھٹکے ہوئے راستہ سے چینی مذہبی فلسفہ اور ہندو فلسفۂ تصوف کی پگڈنڈیوں نے مذہب اسلام کی شاہراہ پر ڈالا، راہِ مستقیم پر چلانے والے کی شان دیکھئے کہ کیسی کیسی پگڈنڈیوں سے گزار کر صراطِ مستقیم پر ڈالتا ہے، مولانا کا الحاد سے اسلام کی طرف آنا اس کا ایک بین ثبوت ہے، صرف سچی طلب و تڑپ شرط ہے، بقول مولانا کے "ہندو فلسفہ اور جوگیانہ تصوف نے کفر و ایمان کے درمیان گویا پل کا کام دیا۔"

اسی زمانہ میں مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ کی جلد اوّل نظر سے گزری، مولانا فرماتے ہیں: "سب سے بڑی ٹھوکر اپنے کو سیرتِ نبویؐ ہی کے سلسلہ میں لگی تھی، مستشرقین اور فرنگی محققین" کے مخفی حملوں کا اصلی ہدف یہی ذاتِ اقدس تھی، خصوصًا سلسلۂ غزوات۔ مولانا شبلی کی کتاب کو شوق اور غور سے پڑھا، خصوصًا حصۂ غزوات کو اور اس نے آنکھیں کھول دیں، اب ذہن اس نتیجہ پر پہنچا کہ محمد عربیؐ نعوذ باللہ ظالم و فاتح قسم کے ہرگز نہ تھے، بلکہ اس زمانہ کے اور وقت کے سب سے بڑے مصلح تھے اور قدم قدم پر عدل کے حدود کو ملحوظ رکھا، آج یہ باتیں ہلکی قسم کی معلوم ہوں گی، بلکہ سوئے ادب کا پہلو پوری طرح لئے ہوئے لیکن خیال میں اس معاند کو لے آئیے جسے رسالت سے پوری طرح بغض پیدا ہو چکا تھا، اس کے لئے اسی دولت کا میسر آجانا کیا کم تھا۔"

اسی دور میں مولانائے رومؒ کی مثنوی کی مکمل چھ جلدیں ہاتھ لگیں، اس کے مطالعہ کا حال مولانا سناتے ہیں: "شاید چند ہی صفحے پڑھے ہوں گے کہ نظر آنے لگا کہ اب میں اپنے ارادے سے کتاب کو نہیں پڑھ رہا ہوں، بلکہ کتاب خود مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور میں بے اختیار اس کی طرف کھینچتا چلا جا رہا ہوں، فارسی زبان کو برائے نام سمجھنے کے باوجود کشش کا یہ عالم تھا کہ جی یہی چاہتا تھا کہ کہاں کا کھانا پینا اور کہاں کا سونا، بس کمرہ بند کر کے دن رات اسی کتاب کو یکلخت پڑھتے جائیے اور جا بجا چینخ چینخ کر روتے جائیے۔"

یہ تھے اسلام کی شاہراہ پر مولانا کے ابتدائی قدم۔

اس دورِ ظلمت سے دورِ ہدایت تک پہنچنے میں حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ (جن کی شبینہ مجلس کے مولانا دریابادی رکنِ رکین تھے) کے طعن وطنز، مولانا محمد علی جوہرؒ (جن سے آپ کو والہانہ عشق تھا) کی نصیحت آمیز ڈانٹ ڈپٹ اور ہمہ وقتی ہم نشینی وصحبت اور آخر کار حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی صحبت بابرکت، رائے مشورے، خط وکتابت نے گویا انہیں از سرِ نو مشرف بہ اسلام کر دیا، الحمد للہ ثم الحمد للہ اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت سے دین کا ایسا کام لیا کہ دنیا عش عش کرتی رہ گئی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم

حیات وخدمات — ایک نظر میں

ولادت: ——— ۱۸۹۲ء ○ وفات: ——— ۱۹۷۷ء

۱ مارچ ۱۸۹۲ء ولادت بمقام دریاباد، ضلع بارہ بنکی (یوپی)

۲ سنہ ۱۹۱۲ء کیننگ کالج لکھنؤ (اب یونیورسٹی) سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔

۳ 〃 ۱۹۱۶ء باندہ میں شیخ یوسف الزماں کی دختر سے عقد ہوا۔

۴ 〃 ۱۹۱۷ء انگریزی کتاب سائیکالوجی آف لیڈرشپ لندن سے شائع ہوئی۔

۵ 〃 ۱۹۱۸ء الحاد سے مذہب کی طرف واپسی ہوئی۔

۶ 〃 ۱۹۱۸ء دار الترجمہ حیدر آباد میں ملازمت شروع کی۔

۷ 〃 ۱۹۱۹ء نظام حیدر آباد کے یہاں باریابی ہوئی اور علمی پنشن منظور ہوئی جو تاحیات ملتی رہی۔

۸ 〃 ۱۹۲۵ء ہفتہ وار "سچ" لکھنؤ سے جاری کیا۔

۹ 〃 〃 صوبہ خلافت کمیٹی اودھ کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۰ 〃 ۱۹۲۹ء حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی، سفر کے حالات اپنے مخصوص انداز میں "سفرِ حجاز" کے عنوان سے لکھے، جو آج بھی زائرِ حرم کے لئے ایک مفید تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۱ 〃 ۱۹۳۳ء انگریزی ترجمہ قرآن کی مشغولیت کے باعث "سچ" کو بند کرنا پڑا۔

۱۲ 〃 ۱۹۳۵ء "صدق" ہفتہ وار جاری کیا۔

۱۳ 〃 ۱۹۴۱ء انگریزی ترجمہ وتفسیر کا پہلا پارہ تاج کمپنی لاہور نے شائع کیا۔

۱۴ سنہ ۱۹۵۰ء "صدق" کے بجائے ہفتہ وار "صدقِ جدید" نکالنا شروع کیا۔

۱۵ 〃 ۱۹۵۱ء دار المصنفین اعظم گڈھ کی مجلس عاملہ کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۶ 〃 ۱۹۵۴ء ملک غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان کی دعوت پر پاکستان تشریف لے گئے "ڈھائی ہفتہ پاکستان میں" کے عنوان سے اپنے مخصوص انداز میں وہاں کے حالات لکھے۔

۱۷ 〃 ۱۹۵۷ء لاہور (پاکستان) میں منعقدہ اسلامی مذاکرہ میں ہندوستانی وفد میں گئے۔

۱۸ 〃 ۱۹۶۶ء حکومتِ یوپی نے قابلِ قدر تصانیف کی بنا پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیا۔

۱۹ 〃 ۱۹۶۶ء حکومتِ ہند کی طرف سے عربی میں فضیلت کی سند ملی۔

۲۰ 〃 ۱۹۶۷ء جناب رادھاکرشنن صاحب صدر جمہوریہ نے یہ سند راشٹرپتی بھون میں عطا کی۔

۲۱ 〃 ۱۹۷۴ء فالج کا پہلا حملہ دریاباد میں ہوا۔

۲۲ 〃 ۱۹۷۶ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کانووکیشن میں "ڈاکٹر آف لٹریچر" کی اعزازی ڈگری صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم نے عطا کی۔

۲۳ 〃 ۱۹۷۷ء ۶ جنوری ۱۹۷۷ء اپنی قیام گاہ خاتون منزل حیدر مرزا روڈ لکھنؤ میں صبح ۴½ بجے جان جانِ آفریں کے سپرد کی، ایک نمازِ جنازہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اقتدا میں بہت بڑے مجمع نے پڑھی، اور دوسری نمازِ جنازہ آبائی وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی میں حافظ غلام نبی (مرحوم) کی اقتدا میں بعد نمازِ مغرب پڑھی گئی، جس میں قصبہ اور قرب و جوار کے لوگ بڑی تعداد میں شریک تھے۔ تدفین آبائی مکان محلہ مخدوم زادگان کے پیچھے درگاہ حضرت مخدوم آبکش میں عمل میں آئی۔

مولانا دریابادی کی تحریر کا عکس

کثرتِ تحریر کی وجہ سے مولانا کی تحریر کا پڑھنا ہر کس و ناکس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا مولانا نے بعض دفعہ اپنے آپ کو "بدخط" بھی لکھا ہے، تحریر کا عکس اور اس کی صاف شدہ نقل بھی درج ذیل ہے:

چند اور حضرات کے نام خطوط بھی (بطور نمونہ مضمون) یہاں نقل کئے گئے ہیں۔

(3) 27 11/63

بسم اللہ

ہفتہ وار صدق (جدید)

مورخہ ۔۔ ۲۷ نومبر ۱۹۶۳ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

عزیزم۔ السلام علیکم۔

[illegible]

(4) 11 2/64

بسم اللہ

ہفتہ وار صدق (جدید)

مورخہ ۔۔ ۹ فروری ۱۹۶۴ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

[illegible]

(2) 15/11/70

میری خوشدامن رقیہ خاتون مرحومہ زوجہ عبدالحمید خاں صاحب کے انتقال پر حضرت نے یہ تعزیت نامہ ارسال فرمایا۔ جو ڈاکٹر عبدالمجید اللہ صاحب کی والدہ تھیں۔

دریاباد

عزیز با سلیقہ، وعلیکم السلام

[illegible]

(1) Read on 18-1-61

بسم اللہ

صدق جدید

۔۔۔ جنوری ۱۹۶۱ء دریاباد ضلع بارہ بنکی

مکرم گرامی، وعلیکم السلام

[illegible]

مکتوب[۵]: بنام محمد بہاء الدین، حیدرآباد۔

۱۱ر نومبر ۱۹۷۰ء۔ از دریاباد۔

بسم اللہ

عزیزی و مشفقی! وعلیکم السلام

جمعہ کی موت تو بڑی مبارک موت ہے، صرف خوش نصیبوں ہی کے حصہ میں آتی ہے، اعمالِ صالح اور اولاد صالح موجود ہونا اس پر مستزاد، انشاء اللہ مغفرت یقینی ہے، بہرحال دعا خط پڑھتے ہی کردی' اور اس کے بعد بھی کی، عزیز کا عزیز اپنا ہی عزیز ہو جاتا ہے، گھر کی لڑکیاں بھی دعا میں شریک تھیں۔

اولاد کی دعا والدین کے حق میں یوں ہی مؤثر ہوتی ہے، چہ جائیکہ ماہِ رمضان میں!

رمضان میں سب سے بڑی عبادت فضائل والی، روزوں سے کہیں بڑھ کر یہ ہے کہ انسان اپنی زبان و ہاتھ، پیر پر قابو رکھے، حتی الامکان سیئات سے بچتا رہے۔

اللہ قرضداری وغیرہ سے نجات دے۔

ایک بات بصیغۂ راز۔ امکان ہے، اغلب یقین کہ گورنمنٹ مجھے حج کے موقع پر میرے ہی شرائط پر حجاز بھیجے، میں بغیر ایک پرسنل اسسٹنٹ کے سفر نہیں کرسکتا، اگر یہ سب اس نے منظور کرلیا تو تین آدمی میرے ذہن میں ہیں، انہیں میں سے کسی کا انتخاب کرنا ہوگا اور ان تینوں میں ایک نام حاجی بہاء الدین حیدرآباد کا ہے، بشرطیکہ اُدھر سے بھی آمادگی فراغ خاطر کے ساتھ ہو، اس کے لئے گو احتمال اور ہی کا ہے، بہرحال تیار رہنا چاہئے۔ ہوائی جہاز سے آمدورفت کے پانچ ہفتے تو بہرحال لگیں گے، روانگی آخر ذی قعدہ (جنوری) میں جاکر شروع محرم میں واپسی ہے۔ محض احتیاطاً لکھ بھیجتا ہوں.... اپنی سرکاری گرانٹ...... متعین ہوگئی ہے۔

والسلام ۔ عبدالماجد

مکتوب: بنام محمد بہاء الدین۔ حیدرآباد۔

۱۴ر جنوری از دریاباد، بارہ بنکی۔

بسم اللہ

کرم گستر! وعلیکم السلام

---

۵ خوشدامن صاحبہ کے وصال پر جو ڈاکٹر عبدالمجید خان صاحب کی والدہ تھیں۔

نہیں میں آپ کو بھولا نہیں تھا، مگر یاد اب دھندلی ہو چکی تھی، تعزیت کی جزائے خیر اللہ دے گا حج بیت اللہ کا سفر اللہ مبارک کرے اور بخیریت تمام واپس ہو جائیں۔

اس سفر میں کشمکش اچھی خاصی پیش آتی رہتی ہے، اور نفس کا امتحان پورا ہو جاتا ہے۔ مختلف زیارات وغیرہ سب اپنی اپنی جگہ مستحب ہیں، لیکن ہر ناجائز عمل سے بچنا بہت ضروری ہے، اکثر لوگ نوافل کے شوق میں گناہ کر لیتے ہیں، حجر اسود کا بوسہ، خانۂ کعبہ کے اندر داخلہ وغیرہ ایسے ہی امور ہیں، ان کے لئے نہ کسی مسلمان سے دھینگا مشتی جائز ہے، نہ رشوت دینا، بس یہی عرض ہے کہ اس پہلو کو خاص طور پر پیش نظر رکھا جائے اور اس تباہ کار کو بھی حتی الامکان دعاؤں میں یاد رکھا جائے۔

والسلام : عبدالماجد

مکتوب[۵] : بنام حاجی محمد مقتدا خانصاحب شیروانی علی گڑھ۔

۲۵ فروری ۱۹۵۸ - دریاباد۔ بسم اللہ

حضرت والا ! وعلیکم السلام

آپ ماشاء اللہ پیدائش کے وقت سے مقتدا ٹھہرے، آپ کی ہر قرأت پر ہم مقتدیوں کو آمین کہنا واجب، خواہ بالجہر ہو یا بالستر۔

والسلام، دعاگو و دعاخواہ

عبدالماجد

مکتوب[۶] : بنام پروفیسر عبدالوہاب صاحب بخاری، مدراس۔

۳ نومبر ۱۹۵۸ء، دریاباد۔ بسم اللہ

کرم گستر ! السلام علیکم

اس عریضہ کے حامل ماسٹر عزیز الہی بی اے (علیگ) سفیر ندوہ کی حیثیت سے حاضر خدمت ہو رہے ہیں، علاوہ اپنے اس سرکاری حیثیت کے میرے مخلص خصوصی ہیں، نام کے "عزیز" ہیں لیکن مصر ندوہ کے "یوسف" سے کم نہیں، آپ کی نگاہ اعجاز ندوہ کی قدردانی کے لئے

---

۵ موصوف نے مولانا کی خدمت میں ایک مضمون مولانا شبلی پر بھیجا تھا اور اس کے ساتھ ایک دلچسپ خط۔ ۶ بسلسلۂ تعارف جناب (باقی صفحہ ۹۶ پر)

یقیناً کوئی "زلیخا" ڈھونڈ نکالے گی۔

والسلام
عبدالماجد

مکتوب: بنام طالب چکوائی، لاجپت نگر، دہلی۔

۲۲ اگست ۱۹۶۵ء دریاباد
بسم اللہ

کرم گستر! تسلیم

"برگ سبز" موصول ہوگئی تھی، وقت نکال کر ادھر اُدھر سے سیر کرلی۔ "برگ" کا ہے کو ہے، چمن ہے گلزار و شاداب، اور آپ طالب نہیں، اردو کے حق میں تو عین مطلوب ہیں۔

دعاگو
عبدالماجد

مکتوب: بنام نادم سیتاپوری، ۹۱۲ فردوس کالونی، کراچی۔

۱۸ جون، ۱۹۷۱ء، دریاباد۔
بسم اللہ

برادرم سلمہ اللہ! وعلیکم السلام

"فردوس کالونی" کے بسانے والے کو اگر "فردوس مکاں" یا "جنت نشاں" نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟۔

والسلام
عبدالماجد

مکتوب: بنام جناب نواب جعفر علی خانصاحب، اثرؔ لکھنوی

۱۴ ستمبر ۱۹۵۶ء۔ دریاباد
بسم اللہ

مخدوم و مکرم! السلام علیکم

انشاءاللہ، ۱۷ ستمبر (دوشنبہ) کی سہ پہر کو تقریباً ۵ بجے آدھ گھنٹہ کے لئے حاضر خدمت

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: عزیز الٰہی صاحب حسن پوری، جو اُس زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سفیر تھے۔

ہوں گا۔ برسات کا موسم ہے، ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر شدید بارش ہو جائے، اور مجھے شرمندگی سے "پانی پانی" ہونا پڑے۔

والسلام۔ دعاگو

عبدالماجد

مکتوب[۵] بنام جناب خواجہ حمید الدین شاہد صاحب (پروفیسر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ حیدآباد)

۴؍جنوری ۱۹۵۵ء، دریاباد۔

"امجد" نام ور ذی شان کے باب میں "ماجد" گم نام و بے نشان کا کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

شہد کو اور کون سی مٹھاس ڈال کر میٹھا کیا جائے اور نمک میں اور کون سی نمکین ڈال کر نمکین بنایا جائے، وہ میرے افضل التفضیل برائے نام ہی نہیں، زندگی کے ہر صیغہ میں مجھ سے افضل، اکرم، اشرف اور اکمل ہیں، اللہ تعالےٰ ان کی عمر میں، کمالات میں، کرامات میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔

عبدالماجد

مکتوب: بنام یوسف قمر صاحب، ایڈیٹر "ہلالِ نو" پشاور۔

بسم اللہ

۲۸؍جولائی ۱۹۵۵ء دریاباد۔

"ہلالِ نو" یوں بھی ابروئے آسمان اور پھر امت کا قومی نشان، اس کی زیارت کی مشتاق کون سی آنکھ نہ ہوگی، خواہ اس کا طلوع افقِ پشاور ہی سے ہوا کرے۔

اور پھر اس کے ایڈیٹر یوسف قمر! جمال ہی جمال! نورٌ علیٰ نور! چار چاند لگ جانا اسی کو کہتے ہیں۔ اس کی ٹھنڈی روشنی یقیناً ہر دیدہ ور کے لئے "سرمۂ بصارت" اور چشمۂ بصیرت ثابت ہو رہی ہوگی۔

اللہ نور السمٰوات والارض، جلد اسے آسمانِ معنویت و اسلامیت کا بدرِ کامل بنا کر رکھے۔

عبدالماجد

---

[۵] مشہور شاعر حضرت امجد حیدرآبادی پر خواجہ حمید الدین شاہد صاحب نے مضمون مانگا تھا، اس کے جواب میں یہ پیام بھیجا۔

مکتوب : بنام شاہ غلام حسنین صاحب، پھلواری شریف

۱۴ / جنوری ۱۹۷۱ء دریاباد بسم اللہ

برادرم ! وعلیکم السلام

(۱) تحفۂ شمس المعارف پہنچا۔ سبحان اللہ۔ (۲) جلوۂ سلیمان نظروں میں پھر گیا۔ ماشاء اللہ۔
(۳) صدق میں چند سطریں نکلتے ہی نکلیں گی۔ انشاء اللہ۔ (۴) والا نامہ پہنچا۔ بارک اللہ۔
(۵) ضمناً صحت و خیریت بھی دریافت ہوگئی۔ الحمد للہ۔

والسلام ، دعاگو و دعاخواہ

عبدالماجد

مکتوب : بنام، عبدالقوی صاحب دسنوی، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج بھوپال

۶ / مارچ ۱۹۷۳ء دریاباد بسم اللہ

عزیزم سلمہ ! السلام علیکم

یہ اچھا مذاق میرے ساتھ رہا، فرطِ اشتیاق سے میں نے ریل پر بیٹھتے ہی چہرہ سے نقاب کہئے، یا برقع اتارا، تو سبحان اللہ، فرطِ نزاکت سے ع: "ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے" کا عالم۔ مجبوراً، عطائے تو لقائے تو۔ دلی شکر گزار بہرحال ہوں۔

مکتوب الیہ مولانا مرحوم کے خصوصی ارادت مند تھے، جب بھی مولانا بھوپال تشریف لے جاتے تھے، یا بمبئی، مدراس، حیدرآباد جاتے ہوئے بھوپال سے گزرتے تو مکتوب الیہ ان سے ملنے ضرور اسٹیشن پر آتے، اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی مولانا مرحوم کی آخری زندگی تک جاری رہا۔ مارچ ۷۳ء میں بھوپال میں ملاقات کے وقت مولانا مرحوم نے مکتوب الیہ سے نواب شاہ جہاں بیگم کا دیوان دیکھنے کو مانگا تھا، مکتوب الیہ نے اسے چلتے وقت کاغذ میں لپٹا ہوا دیا، ریل پر بیٹھنے کے بعد اس کو کھولا تو اندر سے بے حد پھٹا ہوا، گویا پڑھنے کے قابل ہی نہ تھا، مکتوب بالا اسی بارے میں ہے۔ دیوان بھی اسی کے ساتھ واپس کر دیا۔

مکتوب: بنام چودھری عشرت علی صدیقی، ایڈیٹر "قومی آواز" لکھنؤ۔

۱۶/اپریل ۱۹۷۳ء لکھنؤ۔ بسم اللہ

عزیزم ! السلام علیکم

خدا کرے اب شفائے کامل ہوگئی ہو، حکیم عبدالقوی سے حادثہ کا حال سخت افسوس کے ساتھ سنا، بعد کو افاقہ بھی معلوم ہوگیا تھا، خدا کرے اب بالکل ہی صحت ہو۔

آپ کے اخبار میں ایک تکلیف دہ اور غلط لفظ برابر نکل رہا ہے "جسم فروشی" غلط اس لحاظ سے کہ عورت اپنا جسم نہیں بیچتی ہے، جسم کا صرف ایک محدود حصہ عصمت بیچتی ہے، اور صحیح نام اس کے لئے عصمت فروشی ہر لغت میں موجود ہے۔ دوسرا غلط ایسا ہی لفظ "بدسلوکی" آپ کے یہاں چلا ہوا ہے (MISBEHAVIOR) کے معنیٰ جو صحیح ایک بالکل دوسرے موقع کے لئے۔ اس خاص معنیٰ کے لئے اردو میں ایک نہیں متعدد لفظ چلے ہوئے ہیں، "منہ کالا کرنا" "فحش کاری کرنا" بدکاری، آبروریزی، بدفعلی۔ سائن بورڈوں میں اب تک اردو کو جگہ نہ ملی، نہ تو صوبہ کانگریس کمیٹی کے دفتر، نہ ضلع کانگریس کمیٹیوں کے دفتر میں، لکھنؤ سٹی کمیٹی کو مستثنیٰ کرکے

عبدالماجد

بہادر شاہ ظفر اور اُن کی شاعری

انسان اور انسانیت کی تلاش

محمد رضوان القاسمی

انسان مخدوم کائنات ہے ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چیز اس کی خدمت پر کمر بستہ ہے، تسخیر کائنات کے فن اور ہنر سے آشنا کیا گیا ہے' وہ کائنات میں خدائی تخلیق کا شاہکار بھی ہے۔ اسے بارگاہِ الٰہی سے شرف وکرامت کا تمغہ بھی ملا ہے' اسی بارگاہ سے وہ مسجود ملائک بھی بنایا گیا۔

کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہوں' پر دیکھو چشم حقیقت سے
میں ہوں ظفر مسجود ملائک' گرچہ خاک کا پتلا ہوں

لیکن اونچی شان کا یہ انسان گراوٹ پر آتا ہے تو اس کے سامنے درندہ صفت حیوان بھی شرما جاتا ہے۔ بقول احسان دانش۔

قلبِ انساں نے وہ استبداد کا پکڑا ہے رنگ
دیکھ کر جس کو گڑے جاتے ہیں غیرت سے پلنگ

بہترین ساخت پر پیدا کئے جانے والا اونچی شان کا یہ انسان گھٹتا ہے اور گراوٹ پر آتا ہے تو کہاں تک پہنچتا ہے اس کی منظر کشی ایک دیدہ ور اور بالغ نظر انسان نے خوب کی ہے۔

"بہترین ساخت پر پیدا کئے جانے کے بعد جب انسان اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو برائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے اسے گراوٹ کی اس انتہاء تک پہنچا دیتا ہے کہ کوئی مخلوق گراوٹ میں اس حد کو پہنچی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی کمینہ پن، غیظ وغضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں جو لوگ غرق ہو جاتے ہیں' وہ اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف اسی ایک بات کو لے لیجئے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں تمام درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لئے کسی جانور کا شکار کرتا ہے جانوروں کا قتل عام نہیں کرتا، مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے مگر یہ

احسنِ تقویم پر پیدا ہونے والا انسان اپنی عقل سے کام لے کر توپ' بندوق' ٹینک' ہوائی جہاز' ایٹم بم' ہائیڈروجن بم اور دوسرے بے شمار ہتھیار ایجاد کرتا ہے تاکہ آن کی آن میں پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے' درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے ایسے ایسے دردناک طریقے اختراع کرتا ہے جن کا تصور بھی کبھی کسی درندے کے دماغ میں نہیں آسکتا' پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے کمینہ پن کی اس انتہاء کو پہنچتا ہے کہ عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے۔ ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ باپوں' بھائیوں اور شوہروں کے سامنے ان کے گھر کی عورتوں کی عصمت لوٹتے ہیں' بچوں کو ان کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں' ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں' انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی مقابلہ کر سکتی ہو"۔

انسان کے یہی وہ غیر انسانی سیاہ کرتوت ہیں' جن کی وجہ سے ایک شاعر محبت و انسانیت کو یہ کہنا پڑا ؎

ہر چند کائناتِ دو عالم میں اے جگر
انساں ہی ایک چیز ہے' انساں مگر کہاں

جگر ہی کے یہ دو شعر ہیں:

جہلِ خرد نے یہ دن دکھائے گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
کارِ زمانہ جتنا جتنا بنتا جائے بگڑتا جائے

جگر ہی کا یہ شعر نہایت معنی خیز ہے ؎

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

پھر ملک الشعراء غالبؔ نے یہ کہہ کر تو کمال ہی کر دیا ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

معلوم ہوا کہ انسان کا بنیادی' جوہری اور امتیازی وصف "انسانیت" ہے۔ یہ وصف اگر انسان کے اندر ہے تو اس کے پاس کچھ نہ رہتے ہوئے بھی سب کچھ ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو اس کے پاس سب کچھ رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ انسان کے اندر انسانیت کس قدر ہے؟ اس کا اظہار اس کے اعمال' اخلاق' اطوار' عادات' معاملات' نشست و برخاست اور شب و روز کے لمحات سے ہوتا رہتا ہے۔ اچھے انسان کی پہچان یہ

ہے کہ اپنے جیسے انسان سے وہ انس رکھتا ہے، صلح، رواداری، امن و سلامتی اور نفع رسانی کے جذبات سے اس کا سینہ موجزن رہتا ہے، خدمت خلق کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی کی دل داری "حجِ اکبر" سے کم نہیں ہوتی ہے۔ ہر قسم کی اذیت رسانی سے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ کو روکے رکھتا ہے، کسی کی دل خراشی نہیں کرتا، ظلم اور ناانصافی کے قریب نہیں جاتا، افواہ طرازی اور الزام تراشی کی خواس کے اندر نہیں ہوتی ہے، کسی کی عزت و آبرو سے نہیں کھیلتا، دوسروں کی بہو بیٹی اور بہن کو اپنی بہو بیٹی اور بہن کا درجہ دیتے ہوئے ان کو ہوس کا نشانہ بنانا کیا، ان کی طرف نگاہِ غلط بھی نہیں اٹھاتا، نفاق اور شقاق سے اپنے دل کے آئینہ کو میلا نہیں کرتا، ناحق قتل نہیں کرتا، عورتوں کو کم جہیز لانے پر یا ان سے بعض شکایتوں کے ہونے پر زندہ نہیں جلاتا، یا کچل کچل کر نہیں مارتا۔ کسی کی زمین اور جائیداد پر ناجائز قبضہ نہیں کرتا، جھوٹے مقدمے میں کسی کو نہیں پھانستا، غیظ و غضب میں آپے سے باہر نہیں ہو جاتا، خود بینی اور بد بینی سے اجتناب کرتا ہے کبر و غرور اور عجب سے بچتے ہوئے انکسار، تواضع اور ملنساری کی صفت کو اپناتا ہے، حسن سلوک میں اہلِ دولت اور اصحابِ ثروت ہی کو نہیں بلکہ غربت زدہ لوگوں اور پچھڑے ہوئے انسانوں کو بھی اہمیت دیتا ہے اور ایسے لوگوں میں رہ بس کر اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل کر کے اپنے خدا کو پانے کی کوشش کرتا ہے، آئین عدل و مساوات کا پابند ہوتا ہے، خاندان اور قبیلہ کی تقسیم کو "تعارف" (شناخت اور جان پہچان) کا درجہ دیتا ہے، نہ کہ اس کو اپنے لئے "تفاخر" (ایک دوسرے پر فخر کرنا) کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اس کی بہترین ترجمانی پنڈت برج نرائن چکبست کے اس شعر سے ہوتی ہے:

دردِ دل، پاس وفا، جذبہ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

اردو شاعری یا کلام شعراء کے موضوعاتی مطالعہ میں (جس میں ایک شاعر، ایک موضوع کو پیش نظر رکھا گیا ہے) اسی موضوع یعنی "انسان اور انسانیت" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ موضوع مختلف اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ تازہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے واقعات میں تقریباً دُگنا اضافہ ہو گیا ہے۔ قومی انسانی حقوق کمیشن کی سالانہ رپورٹ جو حال ہی میں پارلیمنٹ میں پیش کی گئی ہے، اس سے واضح ہے کہ ۹۷-۱۹۹۶ء میں کمیشن کو (۱۰،۱۹۵) شکایات انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی وصول ہوئی ہیں، ہمارے نصابِ تعلیم میں "ماحولیات" کو مستقل مضمون کی حیثیت سے شامل کرنے پر غور کیا جا رہا ہے، مگر "اخلاقیات" کے لئے کوئی جگہ نہیں نکالی جا رہی ہے، اخبارات میں بھی ایسے مضامین کم ہی جگہ پاتے ہیں، البتہ اخلاق سوز حرکتوں اور غیر انسانی وحشت ناک

کرتوتوں کی خبریں نمایاں جگہ حاصل کرتی ہیں الکٹرانک میڈیا بھی خاموش ہے، کبھی کوئی چیز آ بھی جاتی ہے تو ایسے ہی جیسے سیاہ بادل کی اوٹ سے بجلی کوند گئی ہو، علماء، مصلحین، دانشور، شعراء، سبھوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اپنے انداز سے انسان کے "انسانی جذبات" کو پروان چڑھائیں اور ہر سطح کے لوگوں کو انسانی قدروں سے روشناس کرائیں۔ دل دردمند اور فکرِ ارجمند رکھنے والے عالمِ اسلام کے بلند پایہ عالم دین کی "تحریکِ پیام انسانیت" کا قیام اسی پسِ منظر میں عمل میں آیا ہے جسے وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھ کر توسیع دینا اور استحکام بخشنا ہر انسانیت پسند کا کام ہے۔

جہاں تک تعلق بہادر شاہ ظفر کا ہے تو واقعہ ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اپنی شاعری میں انسان کے مرتبے کو بہت بلند و بالا بتایا ہے۔ ظفر کو انسان، انسانیت، اخلاق اور اخلاقی اقدار سے دل چسپی شاید ان کے متصوفانہ ذہن و فکر کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، ان کا شغفِ تصوف اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ باضابطہ بیعت بھی کرنے لگے تھے، لال قلعہ میں باقاعدہ تصوف کے درس ہوتے تھے، اور ظفر خود رموز و نکات بیان کرتے تھے، ان کا یہی وہ ذوقِ تصف ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنی کم عمری ہی میں مولانا فخر الدین سے بیعت ہو گئے تھے، ان کے بعد ان کے فرزند مولانا قطب الدین اور پوتے نصیر الدین عرف کالے صاحب سے بھی برابر عقیدت و مودت جاری رکھے ہوئے تھے۔ ظفر نے بے شمار اشعار ان بزرگوں کی شان میں کہے ہیں اور اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کیا ہے:

مرید قطب دیں ہوں خاک پائے فخر دیں ہوں میں
اگر چہ شاہ ہوں، ان کا غلامِ کم ترین ہوں میں

بہادر شاہ ظفرؔ (۱۸۶۲ء۔۱۷۷۵ء) کے بارے میں اتنی بات تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ یہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے اور دلی کے آخری تاجدار، ان کا پورا نام ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی ہے۔ یوں تو ہندوستان کی سلطنت ان کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہی ہاتھ سے نکل چکی تھی مگر برائے نام سہی بادشاہ مانے جاتے تھے۔ اور لال قلعہ میں شاہانہ سطوت و حشمت کے ساتھ حکومت کرتے اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ شاعری سے فطری لگاؤ نو عمری ہی سے قائم ہو گیا تھا، جس کا سلسلہ آخری دم تک باقی رہا۔

طبیعت ہے جو اس پیری میں بھی وہ اے ظفر تیری
سخن فہمی، سخن سنجی، سخن دانی نہیں جاتی

ظفرؔ نے پہلے شاہ نصیر سے اصلاح لی اور بعد میں ذوق کے شاگرد ہوئے۔ زبان اور محاورہ اور

سلاست وسادگی، ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، غزلیں، مسدس، مخمس، مثلث، سہرا، سلام سب ہی لکھے، مستزاد بھی ہیں، اکثر طویل بحروں میں لکھا کرتے تھے۔ کلام ان کا مطبوعہ ہے، جس کی وجہ سے کل کی طرح آج بھی ان کا فیض سخن جاری ہے۔

زمانے میں جو کہلاتے ہیں شاعر آجکل اچھے
ظفرؔ رتبہ ملا ان کو ترے فیضِ سخن سے ہے

ظفر کی ابتدائی شاعری میں عیش وطرب ہے، رنگینیاں اور قہقہے ہیں، شگفتگی اور خوش مزاجی کی پھواریں ہیں، بعد میں جب ان کے ارمانوں کی دنیا خونچکاں ہونے لگی، شدائد اور مصائب کے وہ گھیرے میں آگئے، آسانیاں سختیوں میں بدلنے لگیں تو مایوسی نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا، ان کا یاس انگیز کلام دراصل اسی دور کی یادگار ہے۔ مطالعہ نگار کو ان کی شاعری میں دونوں طرح کے نمونے ملتے ہیں۔

بہکانے والے آکے سب یار بن گئے
سمجھانے والے مفت گنہگار بن گئے

نہ بھیجا تم نے لکھ کر ایک پرچہ
ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا

الٰہی محتسب سنگ دل کے ٹوٹیں ہاتھ
کہ توڑتا ہے یہ جام وسبو تڑاق پڑاق

یار نہیں، غمخوار نہیں، ہمدرد ظفرؔ اَب کوئی نہیں
کنجِ غم میں آپ ہی کہیئے دل کو مرے بہلائے کون

میں نہیں ہوں نغمہ جانفزا مجھے سن کے کوئی کرے گا یا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

شب وروز پھول میں جو تلے، کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انہیں، کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے

ظفرؔ نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بڑے رنج اٹھائے اور آخر کار رنگون میں جلاوطن کر دیئے گئے اور وہیں بے کسی کی موت پائی، اپنی زندگی کی بے چارگی کو دیکھتے ہوئے نہایت حسرت ویاس کے ساتھ وفات سے پہلے کہا تھا۔

کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

حاصل یہ کہ ظفرؔ بادشاہ تھے' صوفی تھے' شاعر تھے' صاحبِ زبان تھے' پاکباز تھے' مبتلائے غم تھے' مظلوم زمانہ تھے' دردمند تھے اور انسانیت نواز تھے۔ آیئے! دیکھیں کہ مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ ظفرؔ "انسان اور انسانیت" کے موضوع پر کیا کہتے ہیں اور کس انداز سے کہتے ہیں' شاہ ظفرؔ ٹوٹا ہوا دل رکھتے تھے' ٹوٹے ہوئے دل کی صدا یقیناً عام انسانی دل پر دستک کا کام کرے گی اور "از دل خیزد' بر دل ریزد" کا مصداق بنے گی۔

"دیوانِ ظفر سے ہم نے جو اس موضوع کے لئے اشعار منتخب کئے ہیں' وہ یہ ہیں۔

اتنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل
دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل

کم ظرف' پر غرور' ذرا اپنا ظرف دیکھ
مانند جوش خم نہ زیادہ ابل کے چل

فرصت ہے اک صدا کی یہاں سوزِ دل کے ساتھ
اس پر سپند وار نہ اتنا اچھل کے چل

یہ غول وش ہیں' ان کو سمجھ تو نہ رہنما
سایہ سے بچ کے اہل فریب و دغل کے چل

اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل
بل ہے تو بل کے بل پہ تو کچھ اپنے بل کے چل

پھر آنکھیں بھی تو دی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم
کہتا ہے کون تجھ کو نہ چل' چل سنبھل کے چل

اس کو انساں مت سمجھ ہو سرکشی جس میں ظفرؔ
خاکساری کے لئے خاک سے انساں بنا

اے ظفرؔ خاک سے انساں کا بنا ہے پتلا
خاکساری ہی سے دنیا میں ہے انساں کی نمود

تمہارے ہاتھ دولت آگئی ہے خاکساری کی
ظفؔر تم کیوں نہ لے کر ہاتھ میں اکسیر رکھ دو

کہاں ہیں وہ اگلی ملاقات والے
عنایات والے ، مدارات والے

انساں ہے وہی جس میں ہو انساں کی سیرت
ہیں یوں تو ہزاروں ظفؔر انساں کی صورت

ہو نہ انسانیت انساں میں تو پھر انساں ہے کب
اے ظفؔر گرچہ ہوا ظاہر میں وہ انساں کی شکل

جوش جنگ و جدل پہنے تو کس کے واسطے
ہم تو بیٹھے ہیں ردائے صلح کل اوڑھے ہوئے

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر، رہ دیکھتے اوروں کی عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر، تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

آدمی کو چاہیئے آدم شناسی اے ظفؔر
ہے یہ فرمودہ ہمارے حضرت تیمور کا

ظفر کو باز رکھ اعمال بد سے
خطا بخشا ، کرم گارا ، الٰہا

بے تمیزی ہے یہاں تک کہ زمانے میں ظفؔر
نہ وہ تنظیم سی شئی ہے نہ وہ آداب سی چیز

برائی یا بھلائی ہے اپنے واسطے لیکن
کسی کو کیوں کہیں ہم بدگوئی سے کیا حاصل

اے ظفؔر چاہیئے انساں کو کہے ایسی بات
کہ برا بھی نہ کہے کوئی گرا اچھا نہ کہے

نہ ہوئے جب تلک انساں کے دل سے میل یک جانب
ظفؔر لوگوں کو دکھلانے کو یکسوئی سے کیا حاصل

صَفا

جو دِل کو صاف ہو کرنا' تو خاکساری کر
کرے ہے خاک سے آئینہ' صفا حاصِل

میری ملّت ہے محبت' میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دینداروں میں ہوں

عیب وہنر نہ پوچھو تم آدمی میں کیا ہے
تم میں بھی کچھ نہ کچھ ہے پیارے ہمیں میں کیا ہے

بنایا اے ظفؔر خالق نے کب انساں سے بہتر
ملک کو' دیو کو' جن کو' پری کو' حور وغلماں کو

آدمی کہتے ہیں جن کو کم ہیں دنیا میں وہ لوگ
یوں تو سب اولادِ آدم سے یہ بستی ہے بھری

خوبیٔ جوہر سے ہے انساں کی قدر و منزلت
اور اس میں خوب جوہر کچھ نہیں تو کچھ نہیں

ڈھونڈو تو زمانے میں نہیں مہرو محبت
کس طرح کام آیا ہے ظفؔر ہائے زمانہ

ظفؔر ایسی نہیں ہے کوئی محفل زمانے میں
یہاں کچھ حرف گیری اور سخن چینی نہیں ہوتی

کوچۂ حرص میں لے جائے نہ انساں کو خدا
کہ وہاں تو سگِ دنیا ہیں بھنبھوڑتے کھاتے

ظفؔر ہے خاک کا پتلا یہ انساں
پر اس میں بولتا کیا جانے کیا ہے

کیا اور اس سے ہوگا زمانے کا انقلاب
جو بات عیب کی تھی ہنر ہوگئی تو ہے

ظفؔر رہا وہ بشر خوب اول وآخر
جو خاک پیچھے ہوا خاکسار پہلے ہوا

بلا سے کوئی گر بھلا یا برا ہو، ہمیں کیا غرض اور تمہیں کام کیا ہے
ظفرؔ اَب کسی کی برائی بھلائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں

صحبتِ منافقانہ ہے ہر جا نفاق سے
کچھ اتفاق ہے تو کہیں اتفاق سے

انسان اور انسانیت کا یہ باب ظفرؔ کے ایک شعر پر ختم کیا جا رہا ہے کاش یہ شعر نقش ہر در و دیوار ہو جاتا، ہر آدمی کی نگاہ کی راہ سے دل میں اتر جاتا، ذہن اس کے منشاو مفہوم کو سمجھ سکتا، دماغ اس کے اثرات کو قبول کرتا ہوا اعضاء وجوارح کو اس شعر کے سانچے میں ڈھل جانے کا پابند کرتا تو شاید آج کی سسکتی بلکتی، چیختی، چلاتی کراہتی دنیا کو کچھ قرار آتا، سکون آتا، وحشت ختم ہوتی، کلفت دور ہوتی اور اقبالؔ کے ”پیر رومیؔ“ کو دن کے وقت چراغ لے کر انسان سے بھری دنیا میں ”انسان“ کو تلاش کرنے کی نوبت نہیں آتی۔

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانئے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

☆☆☆

"رخصت ہوا جہاں سے وہ ملت کا پاسباں"

نالہ ھائے دلِ بے تاب

بر وفات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قدس سرہٗ

تاریخ رحلت : ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ م ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء روز جمعہ

از، سید مسرور احمد کتب خانہ دار العلوم سبیل السلام ، حیدرآباد

شیخ زمن ، وہ گلشنِ ندوہ کا باغباں
رخصت ہوا جہاں سے وہ ملت کا پاسباں
اقبال کا تھا فکر تو شبلی کی تھی زباں
اب ڈھونڈیں آہ! اس رخِ زیبا کو ہم کہاں
معمور حکمتوں سے تھا جس کا ہر اک بیاں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

جس کا سراپا عکس تھا احمد شہید کا
نکتہ شناس تھا جو قرآنِ مجید کا
ہم غم زدہ ہیں داغ ہے مردِ سعید کا
اہلِ فلک کو آج ہے پیغام عید کا
کتنی حسیں ہے ان کی عزیمت کی داستاں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

یکتا تھا علم و فضل میں روشن مثال تھا
قدسی نفس تھا حضرتِ سیدؒ کا لال تھا
کوئی جفا کرے بھی تو شیریں مقال تھا
تحریفِ دیں پہ دیدنی جس کا جلال تھا
راہِ خدا میں رہتا تھا جو شیر نیستاں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

احکامِ رب پہ کرتا تھا قربان دل وجاں
ہیں عالمِ اسلام پہ اس کے بڑے احساں
رکھتا تھا پیچ و خم پہ نظر تا حدِ امکاں
رہتا تھا بحرِ غم میں بھی مثلِ گلِ خنداں
تھا جس کا بیاں باعثِ تسکین دل وجاں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

انسانیت کا جس نے دیا تھا سدا پیام
نازاں تھے اس پہ مصر ہو اردن ہو یا کہ شام
واقف تھے جس کے کام سے ہر ایک خاص و عام
تنظیم گلستاں سے جو ہوتا تھا شادکام
وہ رہ نوردِ شوق تھا ہر دم رواں دواں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

اس کو کبھی رجھا نہ سکی طلبِ منفعت
آغوش ماں نے اس کو عطا کی تھی معرفت
فضلِ خدا سے جس کو ملی قدر و منزلت
بہلا سکی نہیں اسے دنیا کی منقبت
عیش و طرب سے جس کا پرے تھا سدا مکاں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

صفا

رمز آشنا رہا تھا جو شرعی نظام کا — وہ میرِ کارواں تھا سبیل السلام کا
شیدا تھا، قدرداں تھا جو حسنِ کلام کا — چرچا تھا جس کے کام کا اور جس کے نام کا
سکّہ تھا جس کے علم کا ترکی میں بھی رواں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

ندوہ تھا جن کے زیرِ نگیں مرکزِ علوم — وجد آفریں ہے جس کی فضا پر مہ و نجوم
رہتا ہے روز و شب جہاں فرزانوں کا ہجوم — صد مرحبا کہ جس کی ہے بزمِ جہاں میں دھوم
چشمِ فلک نے دیکھا ہے یہ ارمغاں کہاں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

رہنا ہے ذی وقار تو ہو بحرِ بے کراں — بڑھنے کی ٹھان لی ہے تو پھر ہوگے کامراں
قربانیوں سے ملتی ہے لاریب عزّ و شاں — تاریکیاں جہاں بھی ہوں بن جاؤ کہکشاں
مسرور جن کے نطق سے ہوتا تھا یہ عیاں
وہ آئینۂ صدق و صفا تھے علی میاںؒ

---

۱ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ کے استاذِ گرامی، ممتاز عالمِ دین، مشہور سیرت نگار نبویؐ، نابغۂ عصر حضرت مولانا سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ۔

۲ یادش بخیر، دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد نے علم و ثقافت اور دین و شریعت کی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۷۲ء میں کیا اور بحمد اللہ دیکھتے ہی دیکھتے اس درس گاہ نے بانی جامعہ حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی حفظہ اللہ کی سرکردگی میں ایک شاداب ادارہ کی حیثیت حاصل کرلی —— وہ بڑی مبارک و مسعود ساعت تھی، جب ۲۷؍ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ م ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۸۲ء بروز جمعہ وسیع تر اراضی اور پر فضا مقام مدینۃ العلم (عقب صلالہ بارکس حیدرآباد) میں اس جامعہ کی نئی جگہ میں نئی عمارت کا سنگِ بنیاد مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمۃ کے مبارک ہاتھوں رکھا گیا تھا، جہاں حضرت مولانا مرحوم کی متعدد بار تشریف آوری ہوئی ہے۔ رابطہ ادبِ اسلامی کا سہ روزہ جو سیمینار۳ ہوا تھا، اس میں بھی حضرت کی شرکت ہوئی تھی، اس کے بعد حضرتؒ حیدرآباد تشریف نہیں لاسکے۔ جامعہ کو حضرت سے اور حضرت کو جامعہ سے جو انس و تعلق رہا ہے اور ذہنی و فکری ہم آہنگی حضرتؒ سے رہی ہے، اس لحاظ سے ان کی وفات دار العلوم سبیل السلام "کے لئے ایک" میرِ کارواں "کی وفات ثابت ہوئی ہے۔

---

۳ منعقدہ ۱؍۲؍۳؍ نومبر ۱۹۹۶ء۔

غزلیں

رکنا رہِ حیات میں اہلِ طلب روا نہیں
کون کہاں ٹھہر گیا وقت یہ دیکھتا نہیں

یہ بھی ہے نظمِ گلستاں پھول ہیں ان کی گود میں
جن کو چمن سے دوستو! دور کا واسطہ نہیں

خام ہے ذوقِ جستجو خاک ملیں گی منزلیں
راہبروں میں کام کا ایک رہنما نہیں

صرف مرے ہی دم سے تھی رونقِ بزمِ اہلِ دل
میں جو نہیں تو بزم میں کوئی غزل سرا نہیں

از: اعجاز رحمانی

احباب سے ہم کوئی تمنا نہیں رکھتے
یہ ایسے دئیے ہیں جو اجالا نہیں رکھتے

خوددار ہیں احسان کسی کا نہیں رکھتے
ہم درد تو رکھتے ہیں مسیحا نہیں رکھتے

سب پر تو بہاروں کی نوازش نہیں ہوتی
کچھ ایسے شجر بھی ہیں جو سایا نہیں رکھتے

باہر کی فضا راس کسی کو نہیں آتی
ہم گھر سے نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتے

جو چاہے چلا آئے وہ اپنا ہو کہ دشمن
ہم بند کبھی دل کا دریچہ نہیں رکھتے

ہم شہرِ تمنا کے مسافر تو ہیں لیکن
سر پر کسی دیوار کا سایا نہیں رکھتے

میرا ہی لہو پیاس بجھائے گا زمیں کی
بادل تو برسنے کا ارادہ نہیں رکھتے

اعجاز نہ چھوٹے گا کبھی کوئے ملامت
ہم حوصلۂ ترکِ تمنا نہیں رکھتے

سوال وجواب

محمد رضوان القاسمی

زکوٰۃ کی رقم کو آمدنی کا ذریعہ بنانا

سوال: اگر کوئی شخص، ٹرسٹ یا ادارہ زکوٰۃ کی رقم وصول کرے اور اس وصول شدہ رقم کو کاروبار میں لگائے یا بنک میں جمع کر دے اور زکوۃ کی اصل رقم کو باقی رکھتے ہوئے اس سے حاصل کردہ "آمدنی" یا "نفع" کو غرباء اور مستحقین میں تقسیم کرے یا ایسے لوگوں کے اجتماعی مفادات میں خرچ کرے تو کیا اس سے زکوۃ دینے والے کی زکوۃ ادا ہو جائے گی؟ • ابراہیم بن عبد اللہ مسقطی (سابق ایم ایل اے) •

جواب: آج کل عام طور پر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ زکوۃ لینے، دینے اور اس کو خرچ کرنے والے شرعی احکام وہدایات کا پس ولحاظ نہیں رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے اس سلسلہ میں متعدد قسم کی بے احتیاطیاں، بے اعتدالیاں اور ناہمواریاں سامنے آرہی ہیں، انہیں میں سے ایک وہ ہے، جس کے بارے میں آپ نے سوال کیا ہے۔ کسی شخص، ٹرسٹ یا ادارہ کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ زکوۃ کی رقم وصول کر کے اسے کاروبار میں لگائے یا بنک میں جمع کر دے اور زکوۃ کی اصل رقم کو باقی رکھتے ہوئے اس سے حاصل کردہ "آمدنی"، "نفع" یا "انٹرسٹ" کو غرباء اور مستحقین میں تقسیم کرے یا ایسے لوگوں کے اجتماعی مفادات میں خرچ کرے، اور یہ سمجھے کہ اس سے زکوۃ دینے والے کی زکوۃ ادا ہو گئی۔ جو لوگ زکوۃ دینے والے (اصحابِ نصاب) اور زکوۃ لینے والے (غرباء و مستحقین) کے درمیان واسطہ اور وکیل بنتے ہیں، ان پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مسئلہ زکوۃ کی پوری اہمیت اور نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے دائرہ شریعت سے اپنے قدم کو باہر نہ نکالیں، اور اپنی فکر، سوچ، ضابطہ، منصوبہ اور لائحہ عمل کا ایسا کوئی فریم اور چوکھا تیار نہ کریں کہ اسلام اس فریم اور چوکھٹے میں آنے سے ہزار بار انکار کرے مگر اسے اس میں زبردستی لانے کی مذموم کوشش کی جائے، وہ بھی "خیر وفلاح" کے نام پر اور غرباء پروری اور تعلیمی ومعاشی زبوں حالی کو دور کرنے کے عنوان سے۔ یاد رکھئے دین کا کوئی بھی کام بے دینی کی راہ سے نہیں کیا جاسکتا، ایسے کسی کام پر اجر وثواب اور خیر وبرکت کی امید ایسے ہی ہے جیسے جلتے چولھے میں کاغذ کی تلاش، اور بنجر، سنگلاخ، چٹیل سرزمین سے لالہ وگل کھلنے کی تمنا۔

جو لوگ وکیل، نمائندہ یا درمیانی واسطہ بن کر زکوۃ کی چھوٹی یا بڑی رقم یہاں وہاں وصول کرتے ہیں، ان پر ضروری ہے کہ غرباء اور مستحقین کو رقم زکوۃ یا اس سے غرباء اور مستحقین کے مناسب حال کوئی سامان یا چیز خرید کر، اس کا ان کو مالک بناتے ہوئے ان کے حوالہ کردیں۔ اس میں تاخیر بھی نہ کریں، بغیر خاص ضرورت اور کسی مصلحت کے ایسی تاخیر کو فقہاء نے مکروہ قرار دیا ہے (ردالمحتار جلد دوم صفحہ ۲۷)۔

۲۷۔ غرباء اور مستحقین کی اجتماعی ضروریات اور مصالح و مفادات میں ان کو شخصی حیثیت مالک بنائے بغیر زکوۃ کی رقم کو خرچ کرنا بھی درست نہیں ہے۔

آپ نے جو سوال کیا ہے، اس کا یہ اجمالی جواب ہے، تاہم اس سلسلہ میں جس آزادانہ فکر و روش کو اختیار کیا گیا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اس پر الگ سے وسیع اور مبسوط مضمون لکھا جائے اور زکوۃ دینے والے (اصحاب دولت) اور زکوۃ لینے والے (غرباء اور مستحقین) کے وکیل اور نمائندہ بن کر اس کو وصول کرنے والے کے سامنے ایک صاف "آئینہ" لایا جائے، مگر اسے کسی دوسرے وقت کیلئے چھوڑتے ہوئے اصل مسئلہ کی وضاحت میں دو اہم تحریریں نقل کی جارہی ہیں۔ ہندوستان کے بزرگ اور کہنہ مشق مفتی مولانا سید عبدالرحیم لاجپوری (گجرات) کا فتوی ہے:

"ادائیگی زکوۃ کیلئے تملیک یعنی مستحقین کو بلا عوض مالک بنادینا شرط ہے اگر آمدنی کیلئے پراپرٹی قائم کی گئی یا کوئی زمین خریدی گئی تو یہ شرط پوری نہیں ہوئی لہذا زکوۃ ادا نہ ہوگی۔ لہذا زکوۃ کی رقم سے آمدنی کی جائیداد فراہم کرنا جائز نہیں ہے۔ حقداروں کو بلا عوض مالک بنادینا ضروری ہے"۔

(فتاوی رحیمیہ جلد دوم صفحہ ۸) مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوۃ کی ادائیگی کے لئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف سے کسی مستحق کو مالِ زکوۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے، بغیر مالکانہ قبضہ دئے اگر کوئی مال انہیں لوگوں کے فائدے کے لئے خرچ کردیا گیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاءِ امت اس پر متفق ہیں کہ رقمِ زکوۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے، یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہونچتا ہے جو مصرفِ زکوۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا کپڑا وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جاتا ہے تو صرف اس خرچ کی حد تک رقم زکوۃ صرف ہوسکتی ہے، اسی طرح شفاخانوں میں جو دوا حاجت مند غرباء کو مالکانہ حیثیت سے دیدی جائے اس کی قیمت رقم زکوۃ میں محسوب ہوسکتی ہے، اسی طرح فقہاءِ امت کی تصریحات ہیں کہ

لاوارث میت کا کفن رقم زکوۃ سے نہیں لگایا جاسکتا' کیونکہ میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں' ہاں یہ ہوسکتا ہیکہ رقمِ زکوۃ کسی غریب مستحق کو دیدی جائے اور وہ اپنی خوشی سے اس رقم کو لاوارث میت کے کفن پر خرچ کردے' اسی طرح اگر اس میت کے ذمہ قرض ہے تو اس قرض کو رقم زکوۃ سے براہِ راست ادا نہیں کیا جاسکتا' ہاں اس کے وارث غریب مستحقِ زکوۃ ہوں' تو ان کو مالکانہ طور سے دیا جاسکتا ہے' وہ اس رقم کے مالک ہوکر اپنی رضامندی کے ساتھ اس رقم سے میت کا قرض ادا کرسکتے ہیں' اسی طرح رفاہ عام کے سب کام جیسے کنواں یا پل یا سڑک وغیرہ کی تعمیر' اگرچہ ان کا فائدہ مستحقین زکوۃ کو پہونچتا ہے' مگر ان کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کے سبب ان سے زکوۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی"۔

(معارف القرآن جلد چہارم صفحہ ۴۰۹'۴۱۰ پاکستانی ایڈیشن)

جو لوگ ادارہ یا ٹرسٹ بنا کر غرباء اور مستحقین کے مفادات کی خاطر اہلِ دولت اور اصحابِ استطاعت سے "زکوۃ" وصول کرتے ہیں' انھیں چاہیئے کہ حق گو' باہمت باجرات علماء اور مستند اہلِ افتاء اور ملک کے بڑے دینی اداروں سے مشورہ اور فتوی لے کر ہی نئے زمانے کی نئی ضروریات کی تکمیل کی خاطر کوئی نیا قدم اٹھائیں۔ جو لوگ زکوۃ دیتے ہیں' انھیں بھی چاہیئے کہ زکوۃ کے مصارف' مدات اور خرچ کرنے کے طریقوں کے بارے میں معلوم کر کے اطمینان حاصل کرلیا کریں' تاکہ دین کے ایک کام میں کسی طرف سے بھی بے دینی راہ نہ پائے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آج کے دور کے فتنوں میں ایک اہم ترین فتنہ ہر چیز کو جائز اور مباح کرنے کا رجحان ہے' جس کو "اباحیت پسندی" یا "لبریزم" (Laberalism) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس سے بچنا اور بچانا اللہ تعالی کی توفیق ہی سے ممکن ہے۔

دینی مدارس اور ملتِ اسلامیہ

سوال : قمری لحاظ سے یہ مہینہ شوال کا ہے' اس مہینہ میں دینی مدارس کے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے اور ماہ شعبان میں ان مدارس کا تعلیمی سال اختتام کو پہنچتا ہے' الحمد اللہ دینی مدارس پورے ہندوستان میں موجود ہیں' آپ بتائیے کہ ملت اسلامیہ اور ملک و قوم کو ان دینی مدارس کی ضرورت ہے؟

محمد افضل الدین' مراد نگر

جواب : دینی مدارس' ملت اسلامیہ کا دھڑکتا ہوا دل ہے' وہ دل جس کی دھڑکن زندگی کی علامت ہے اور جس کی خاموشی موت کی خاموشی بن جاتی ہے' دل اگر پورے جسم میں خون پہونچاتا ہے اور اسے سرگرم اور زندہ رکھتا ہے تو یہ دینی مدارس امت مسلمہ کو داعی اور ترجمان فراہم کرتے ہیں' جن کی وجہ سے امت کا

وجود متحرک ' زندہ اور فعال رہتا ہے 'تمام دینی جماعتوں اور اداروں کو یہیں سے کمک اور رسد پہنچتی ہے ' خطیب ہوں یا واعظ ' استاذ ہوں یا مصنف ' مفتی ہوں یا قاضی 'امام ہوں یا امیر یا کوئی مستند دینی خدمت گزار ' سب اسی چمن کے گلہائے رنگا رنگ ہوتے ہیں۔ دینی مدارس کی اہمیت اور ضرورت ہر دور میں رہی ہے 'وہ خلفائے راشدین کا دور ہو یا آج کا پر فتن دور 'خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں اس کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے 'جہاں آئے دن اسلام اور اسلامی علوم و آثار کو مٹانے اور نیست و نابود کرنے کی تحریکیں 'فسطائی قوتوں کے ذریعہ اٹھتی اور ابھرتی رہتی ہیں 'یہ دینی مدارس ہی ہوتے ہیں جو زبردست دفاع اور نگہبانی کا کام کرتے ہیں۔ دینی مدارس کی برکت اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہاں اسلام زندہ اور تابندہ ہے 'اسپین وغیرہ ممالک پر صدیوں تک مسلمانوں کی حکمرانی رہی مگر جیسے ہی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلی وہاں سے مسلمانوں کا وجود غائب ہو گیا اور آج اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہاں کبھی مسلمان آب و تاب اور کروفر کے ساتھ فرمارواِئی کرتے تھے 'اس کی وجہ یہی ہے کہ وہاں "دینی مدارس "کا کوئی نظام نہ تھا مگر ہندوستان میں دینی مدارس کا جال پھیلا ہوا ہے جس کی وجہ سے ہم دین سے وابستہ ہیں 'بلاشبہ دینی مدارس 'دین کے مضبوط قلعے ہیں ،جس کی حفاظت و نگہداشت کی ذمہ داری "امتِ مسلمہ "پر عائد ہوتی ہے۔

بہرحال دینی مدارس کا وجود ملت اسلامیہ کے علاوہ ملک و قوم کے لئے بھی نہایت اہم اور ضروری ہے کوئی ملک اور قوم اسوقت تک حقیقی معنی میں شاہراہِ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اندر اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار نہ ہوں 'یہ مدارس 'اعلیٰ اخلاقی اور انسانی اقدار کو پیدا کرنے کی عظیم فیکٹریاں ہیں ' للّٰہیت 'خلوص 'تواضع 'انکسار 'احترامِ آدمیت 'خدمتِ خلق ،حسنِ سلوک 'رواداری اور عدل و مساوات کا درس اونچے الفاظ اور اونچے سروں سے دیتے ہیں۔ جو لوگ ہندوستان کے دینی مدارس کی حقیقی صورتِ حال اور ان کی علمی ، تحقیقی 'ادبی 'مذہبی اور سماجی خدمات سے صحیح طور پر واقف نہیں ہیں وہی لوگ ان مدارس کے خلاف بیانات دے کر اپنی تنگ نظری 'کج فہمی اور کج ذہنی کا ثبوت دے رہے ہیں 'عصبیت اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا مرض کسی کا اس درجہ پہنچ گیا ہو تو اس کا علاج حکیم جالینوس کے پاس بھی تلاش کرنا بے سود ہے۔ ایسے موقع پر اپنی سی کوشش اور تدبیر کے بعد ان مدارس کی بقا اور حفاظت کیلئے بارگاہِ الٰہی میں دستِ سوال دراز کرنا ہی مفید ہو گا۔ یاد رکھئے! پھیلے ہوئے ہاتھ 'بہتی ہوئی آنکھوں 'ٹوٹے ہوئے دل اور مصر کے بازار میں یوسف کو خریدنے کیلئے ایک بے نوا بڑھیا کا متاع قلیل اور جذبہ اخلاص کی بارگاہِ الٰہی میں بڑی قدر ہے۔

دیارِ لکھنؤ میں چند دن

محمد رضوان القاسمی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات ۳۱/ ڈسمبر ۱۹۹۹ء جمعہ کو ہوئی۔ اس وقت میں دبئی میں تھا' موت ہر زندہ انسان کے لئے ایک اٹل حقیقت ہے' اس لئے ایک نہ ایک دن مولانا کو بھی اپنے رفیق اعلی کے پاس جانا ہی تھا۔ تاہم مولانا علیہ الرحمہ سے راقم الحروف کو طالب علمی کے زمانہ ہی سے جو فکری' ذہنی اور قلبی ربط و تعلق رہا ہے' اور عمر میں اضافہ کے ساتھ اس ربط و تعلق میں بھی اضافہ ہوتا رہا اس کی بنیاد پر مولانا کی وفات کی خبر کا دل اور دماغ پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ ملت اسلامیہ ہند اور عالم اسلام کے لئے اس وقت جو نازک حالات ہیں' ان حالات میں مولانا جیسے باخبر' ہمدرد' مخلص اور متوازن فکر و نظر کے حامل قائد کی قیادت کی سخت ضرورت تھی' یہ سوچ کر بھی رنج و ملال کی پوری کیفیت نے مجھے اپنے گرفت میں لے لیا' مگر اس موقع پر قرآن حکیم کے بتائے ہوئے نسخہ "انا للہ وانا الیہ راجعون" (بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بے شک ہم اسی طرف واپس ہونے والے ہیں) سے کام لیا' بیان کرنے والے نے بیان کیا ہے کہ غم و حزن کے بار کو ہلکا کرنے کے لئے یہ حکیمانہ اور تیر بہدف نسخہ ہے' اور صحائف کائنات میں بے نظیر ہے۔ اپنے ملک اور مولانا علی میاںؒ کی بستی "تکیہ کلاں" (رائے بریلی) سے بہت دور اسی حکیمانہ اور بے نظیر نسخہ نے فائدہ پہنچایا' جناب زاہد علی خاں (ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد) سے ٹیلفون پر گفتگو اور لکھنو اور رائے بریلی سے توثیق کے بعد دبئی سے بیان تعزیت بھی' دل کی تسلی اور دلاسہ کے لئے جاری کردیا' تاہم طبیعت کا تقاضا رہا کہ لکھنو اور رائے بریلی ضرور جانا چاہئے۔

حیدرآباد واپسی کے بعد دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے دعوت نامہ سے معلوم ہوا کہ صدر بورڈ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد بورڈ کیلئے جو صورت حال سامنے آئی ہے' اور دیگر بعض اہم مسائل ہیں' ان پر غور و فکر کیلئے مجلس عاملہ کا اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں ۸/ فروری منگل کو مقرر ہے۔ راقم الحروف نے اس اطلاع کے بعد اجلاس میں شرکت اور مولانا کی تعزیت کیلئے جانے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ۷/ فروری دوشنبہ کو سکندرآباد۔ گورکھپور ایکسپریس ٹرین کے ذریعہ لکھنو پہنچا۔ یہاں سے حیدرآباد واپسی ۱۵/ فروری کو ہوئی۔ اس درمیانی مدت میں لکھنو میں بھی قیام رہا اور رائے بریلی کے علاوہ دوسری

جگہوں میں بھی جانا ہوا۔اس سفر کا جو عمومی اور معلوماتی پہلو ہے' اسے اختصار کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس طے شدہ پروگرام کے مطابق ۸/ فروری کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سلیمانیہ ہال میں ہوا۔ مولانا محمد سالم قاسمی نائب صدر بورڈ نے اجلاس کی صدارت کی مختلف جماعتوں' تنظیموں اور اداروں کے ذمہ داران' ممتاز دانشور' وکلاء اور ارباب فکر ونظر بحیثیت رکن اور مدعو خصوصی قابل لحاظ تعداد میں شریک ہوئے' شریک ہونے والوں میں مولانا سید نظام الدین (جنرل سکریٹری)؛ مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی' مولانا عبدالکریم پاریکھ (خازن)' مولانا محمد رابع حسنی ندوی' ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی' مولانا کلب صادق' مولانا محمد ولی رحمانی (سکریٹری بورڈ)' مولانا مختار احمد ندوی' جناب عبدالستار یوسف شیخ (سکریٹری بورڈ)' جناب سید شہاب الدین' جناب شفیع مونس' مولانا مفتی محمد ظفیر الدین' مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی' مولانا محمد اسلام قاسمی' جناب یوسف حاتم مچھالہ ایڈوکیٹ' جناب عبدالمنان ایڈوکیٹ' ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی' مولانا احمد علی قاسمی' مولانا عبداللہ مغیثی' مولانا مفتی اشرف علی' مولانا سید مصطفیٰ رفاعی' مولانا عبدالوہاب خلجی' مولانا ظل الرحمٰن اور مولانا مفتی عبدالرزاق شامل ہیں۔ حیدرآباد سے راقم الحروف کے علاوہ مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی' جناب محمد عبدالرحیم قریشی (سکریٹری بورڈ) اور مولانا سلیمان سکندر شریک ہوئے تھے۔

اجلاس نے مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (صدر بورڈ) کی وفات پر اظہار تعزیت کیا اور ایک جامع تجویز تعزیت مرتب کی جس میں مولانا کی علمی' دینی' فکری اور ملی ہر جہت سے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا' یہ بھی طے کیا گیا کہ حضرت صدر محترم کے انتقال سے آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کی صدارت کا جو عہدہ جلیلہ خالی ہوا ہے اس پر انتخاب کیلئے آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کا اجلاس عام طلب کیا جائے' کیوں کہ ازروئے دستور صدر کا انتخاب ارکان بورڈ کا اجلاس ہی کرسکتا ہے۔ نیز یہ بھی طے پایا کہ یہ چودھواں خصوصی اجلاس بورڈ لکھنو میں ۲۳/اپریل ۲۰۰۰ء روز اتوار منعقد کیا جائے' اور اس میں شرکت کے لئے صرف اراکین بورڈ سے گزارش کی جائے' یہ بھی طے کیا گیا کہ اس اجلاس کے انتظامات کی ذمہ داری مولانا محمد رابع حسنی ندوی' ناظم ندوۃ العلماء لکھنو کے سپرد کی جائے۔

اجلاس میں ممتاز عالم دین مولانا محمد زماں حسینی (کلکتہ) کے انتقال پر بھی اظہار تعزیت کیا گیا۔

اجلاس میں ایجنڈے کی دفعہ ۵ کے تحت یوپی میں حال میں پاس ہونے والے بل " Uttar Pradesh Regulation of Public Religious Building and place Bill - 2000 " کا تفصیلی جائزہ لیا گیا' تمام شرکاء نے بل کے بارے میں اپنی تشویش اور رنج وفکرمندی کا اظہار کیا اور اس بل کے سلسلے میں

ملکی و قومی پیمانے پر مسلمانوں اور دیگر مذہبی اکائیوں کی طرف سے جس طرح تشویش کا اظہار کیا جارہا ہے' اس پر اطمینان ظاہر کیا' اور ان خطرات کے پیش نظر جو اس بل کی وجہ سے مساجد و مدارس اور دیگر تمام مذاہب کی عبادت گاہوں اور مذہبی تعلیم کے مراکز کو درپیش ہو گئے ہیں' ایک مشترکہ اور مضبوط جدو جہد کی ضرورت محسوس کی۔ مجلس عاملہ کا متفقہ احساس ہے کہ :

(الف) اس بل کے ذریعہ یوپی حکومت نے دستور میں دیئے گئے مذہبی آزادی کا بنیادی حق چھین لیا ہے۔

(ب) یہ بل ہندوستان کی اصل شناخت پر حملہ ہے کہ مذہب وروحانیت اور اس کے مراکز ہی سے قائم ہے۔

(ج) اس بل کی وجہ سے نئی عبادتگاہوں اور مذہبی تعلیم کے لئے مراکز کی تعمیر کے راستے میں رکاوٹ تو پڑے گی ہی' پہلے سے قائم اداروں اور عبادت گاہوں اور مذہبی تعلیم کے مراکز کے لئے بھی اتنی مشکلات کھڑا کردے گا کہ ان کے بند ہونے کی نوبت آجائے گی۔ ان سب وجہ سے یہ بل ہمارے ملک کے سیکولر ڈھانچے اور مذہبی روایات دونوں کے خلاف ہے۔

(د) ایک بہت ہی قابل توجہ پہلو اس بل کا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تمام اختیارات انتظامیہ کے ہاتھ میں دے دیئے گئے ہیں اور عدلیہ کے اختیارات سلب کر لئے گئے ہیں' جبکہ ہمارے گرتے جمہوری ڈھانچہ کا عدلیہ وہ واحد ستون ہے جس پر ملک کے عوام کا آج بھی نسبتہ زیادہ اعتماد ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل ملک میں کئی قوانین کے بھی خلاف ہے جیسے وقف ایکٹ 95۔

ان سب امور کی وجہ سے مجلس عاملہ کی اجلاس نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ صدر جمہوریہ سے درخواست کی کہ وہ اس بل کو اپنی منظوری نہ دیں' بلکہ بل کو منسوخی کیلئے واپس کردیں۔ اجلاس نے تمام مسلم ودیگر تمام مذہبی اداروں اور تنظیموں سے اپیل کی ہے کہ وہ صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم ہند کو اس سلسلہ میں اپنی مخالفت سے ٹیلی گرام و میمورنڈم کے ذریعہ جلد از جلد مطلع کریں۔ نیز ملک کے تمام شہریوں سے بھی اپیل کی گئی ہے کہ جہاں جہاں اس بل کے نتیجہ میں دشواریاں پیش آئیں اس کی اطلاع جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے دفتر (امارت شرعیہ پھلواری شریف' پٹنہ' بہار) کو فوراً دیں۔

اجلاس نے جنرل سکریٹری کو مجاز کیا ہے کہ وہ دیگر مذہبی اکائیوں کے رہنماؤں سے اس سلسلے میں مشترکہ جدو جہد کا لائحہ عمل طے کرنے کے لئے رابطے قائم کریں' نیز قانونی جائزے کے لئے ماہرین قانون کی ایک کمیٹی تشکیل دیں' اور مختلف مذاہب کے نمائندوں کے ساتھ بورڈ کے عہدیداران وارکان پر مشتمل ایک اعلی سطحی وفد صدر جمہوریہ و وزیر اعظم سے اس سلسلے میں ملاقات کر کے اپنے نقطہ نظر سے ان کو آگاہ کرے اور ان سے مطالبہ کرے کہ وہ اس بل کو اپنی منظوری نہ دے کر ملک کو ایک غیر ضروری انتشار سے

بچالیں"۔(بورڈ کی تجاویز کا حصہ ختم)

بورڈ کے اجلاس سے پہلے اور بعد میں مولانا سید محمد رابع حسنی' مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی' مولانا سعید الرحمٰن اعظمی' مولانا واضح رشید ندوی اور دیگر ذمہ داران ندوہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور کسی نہ کسی حیثیت سے حضرت مولانا علی میاںؒ کا ذکر خیر آتا رہا' تاہم طبیعت تکیہ کلاں (رائے بریلی) جانے کے لئے بے چین تھی۔ دل میں بار بار خیال آتا تھا کہ مولانا نہ سہی مولانا کے "نقش پا" تو ملیں گے' مزار پر حاضری دے کر دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ تو اٹھا سکوں گا' "آثار و نشاں" کو دیکھ کر حسرت زدہ دل کو کچھ قرار تو آئے گا۔ چنانچہ ۹/ فروری چہار شنبہ کو اسی سوچ کے ساتھ "تکیہ کلاں" روانہ ہوا' مولانا علیہ الرحمہ کے خاص ارادتمند اور برسہا برس سے تکیہ میں مولانا کے ساتھ رمضان گذارنے کی سعادت حاصل کرنے والے اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے معتقد خاص بزرگ' محترم الحاج بہاء الدین کے علاوہ مولانا مفتی ظفیر الدین' ڈاکٹر محسن عثمانی اور عزیزی محمد نعمان بدر شریک سفر تھے' لکھنو سے تکیہ تک کی دوری کم و بیش (۸۲) کیلو میٹر ہے' ۴ بجے شام ہم لوگ ذریعہ کار یہاں پہنچے۔ نماز عصر اسی تاریخی مسجد میں ادا کی جس میں مولانا نماز پڑھتے تھے' پرانے طرز کی اس مسجد (جو سادگی کی تصویر کے ساتھ جلال و ہیبت کا مظہر ہے) کی بنیاد ۱۸۰۳ء میں مولانا کے خاندان کے بزرگ حضرت شاہ علم اللہؒ نے رکھی تھی۔ نماز سے فراغت کے بعد مولانا کی آخری آرام گاہ (جو مسجد سے متصل مشرق میں مشہور ندی سئی۔ کے کنارے ہے) پر ہم سب حاضر ہوئے۔ ذہن و دماغ میں یادوں کی ایک دنیا بسی ہوئی تھی' دل میں اضطراب تھا' آنکھیں پر نم تھیں' زبان مصروف دعاء تھی' قرآن کی تلاوت بھی جاری تھی' دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے وہاں سے لوٹے۔

مولانا جس قبرستان میں مدفون ہیں' وہ "روضہ شاہ علم اللہؒ" کے نام سے موسوم ہے' حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ مولانا مرحوم کے صدر خاندان تھے ۱۵ قبروں میں ایک قبر' ان کی بھی ہے' پہلے یہاں ۱۴ قبریں تھیں اور سب مولانا کے افراد خاندان ہی کی' صرف ایک قبر کی جگہ تھی' جس میں اب علم و عمل کا یہ گہر اور چمن کا دیدہ ور' اس مسافر کی طرح محو خواب ہے جو رات میں بہت جاگے اور صبح دم آرام کرے آپ یقین جانئے جب میں قبرستان سے نکلنے کے لئے پیچھے کی طرف مڑا' تو یک بیک مولانا عبدالماجد دریابادیؒ یاد آئے۔ مولانا اپنے مرشد اور مصلح حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی وفات کے بعد جب ان کے مزار پر گئے تھے تو اس وقت کا نقشہ انہوں نے اپنے ادیبانہ قلم سے کھینچا ہے' دل کی کیفیت اور موقع کی مناسبت سے ان کی اس تاثراتی تحریر کا یہ حصہ بطور خاص ذہن سے سرگوشی کرنے لگا:۔

"جی میں آیا کہ مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگالے، عقل نے کچھ اور ہی بجھایا، روتی ہوئی آنکھوں اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلام رخصت عرض کیا، اور اپنے کو خانقاہ تک پہنچایا، خانقاہ ! آہ، وہ روح بے جسد، وہ مکان بے مکین، وہ انگشتری بے نگین! مدرسہ چل رہا تھا، لیکن سہ دری خاموش و ویران، بجھی ہوئی شمع، ایک ہو کا عالم، سناٹے کا مقام، نہ دری نہ جاجم، نہ تکیہ نہ مسند نہ ڈسک نہ قلمدان، یاد ایک ایک چیز کی آتی رہی، اور دل کو حسرت و عبرت کی ختم نہ ہونے والی داستان سناتی رہی، یوں آنا ہوتا تھا یہاں بیٹھنا ہوتا تھا، کیا کیا سننے میں، کیا کیا دیکھنے میں آتا تھا، آہ تو کیا تیرا یہ بندہ بھی فانی تھا؟ بے شک موت وفنا تو اس نامور خادم کے آقا تک کے لئے مقدر کر دی گئی تھی، "وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل" (اور محمد تو بس ایک رسول ہی ہیں، ان سے قبل اور بھی رسول گذر چکے ہیں۔ آل عمران۔ ۱۴۴) یہ ایک آیت امت مسلمہ کی تسلی و تعزیت کی کیسی پوری دنیا کی دنیا اپنے اندر رکھتی ہے" (حکیم الامت، نقوش و تاثرات، صفحہ ۶۱۱)

مولانا علی میاںؒ کے مقبرہ کی زیارت کے بعد ہم لوگ مولانا کی خصوصی قیام گاہ کی طرف آئے، اس سے پہلے بھی مولانا کی زندگی میں یہ سعادت حاصل ہوئی تھی، یہاں جب پہنچے تو مولانا کے خاندان کے نوجوان فاضل مولانا سید محمود حسن ندوی نے مولاناؒ کی وہ چارپائی بتائی جس پر وہ تشریف فرما انتقال کے دن قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے، اس کے بعد مولاناؒ کی ایک ایک بات اور ایک ایک چیز وہ بتاتے رہے، کتابوں کی الماریاں بھی کھول کر انہوں نے دکھائیں، یہاں شب و روز کے جو معمولات مولانا کے تھے، اس سے بھی انہوں نے واقف کرایا، ہم لوگ حسرت و یاس کی تصویر بنے ہر بات کو سنتے اور ہر چیز کو دیکھتے جاتے تھے۔ یہ بات چیت اور خارج کا یہ منظر، دل میں جس انداز سے گداز پیدا کر رہا تھا، شاید اس کے کچھ حصہ کا اظہار ان اشعار کے ذریعہ ہو ۔

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں ایک شور تھا غل تھا
جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رورو، یہاں غنچہ، یہاں گل تھا

مولانا کی خصوصی قیام گاہ، مولانا کے آبائی مکان کے سامنے قدیم طرز کی خام اور سفال پوش ہے۔ مربع شکل میں بنی ہوئی اس عمارت پر ظاہری اعتبار سے کہنگی اور خستہ حالی کے پورے آثار ہویدا اور نمایاں ہیں، مگر باطن اور اندر کا ماحول نہایت نورانی اور عرفانی، اسے لوگ یہاں بیٹھکہ، بنگلہ اور دیوان خانہ بھی کہتے ہیں، مگر نصف دنیا کی سیر کرنے اور مالدار ارادتمندوں کا وسیع حلقہ رکھنے والے مرد درویش "کا یہ بیٹھکہ،

بنگلہ اور دیوان خانہ' اس کے درویشانہ مزاج کا مکمل نمونہ اور جیتی جاگتی تصویر' شاید اقبال کے "شاہین" نے ایسے ہی استغنامزاج درویشوں کو دیکھ کر یہ کہنا سیکھا ہو۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ !

مولانا جب تکیہ میں ہوتے تھے تو یہ جگہ مولانا کے لئے سب کچھ تھی' آرام یہیں کرتے تھے پڑھتے یہیں تھے' لکھتے یہیں تھے' ملکی اور غیر ملکی وفود اور اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں بھی یہیں کرتے تھے۔ "پیچ وتاب رازی اور سوز وساز رومی" کیلئے بھی یہی جگہ تھی' عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملتے بھی یہیں تھے' مسئلے اور قضیے بھی یہیں سلجھائے جاتے تھے' یہ جگہ خلوت' خانقاہ اور ذکر نیم شبی کا بھی کام دیتی تھی' لوگوں کے لئے دعاؤں اور مولوی نثار صاحب کے ذریعہ تعویزوں کا سلسلہ بھی یہاں سے جاری رہتا تھا' خطوط کے جواب بھی دئے جاتے تھے' ملک وملت کی رہنمائی بھی یہاں سے ہوتی تھی' ندوہ کے منتظمین' اساتذہ اور طلبہ اپنا "گوہر مراد" بھی یہیں پاتے تھے' اور ہاں! مولانا کے اس "بیٹھکہ" کے کمرہ میں مولانا کی چارپائی کے سامنے جو کھڑکی کھلی ہوئی تھی' اس کے باہر دیکھنے والوں کو داد و دہش کے جلوے بھی نظر آتے تھے۔ کوئی "سائل" ایسا نہیں ہوتا جو واپس ہوتے ہوئے اپنے "علی میاں" کے لئے اللہ میاں سے دعائیں نہ کرتا ہو'

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

جہاں تک تعلق مولانا علی میاں کی بستی "تکیہ" کا ہے تو یہ بستی بہت چھوٹی ہے' اور چند مکانات پر مشتمل ہے۔ مگر تاریخی اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہے' اس چھوٹی سی بستی نے اپنے اپنے وقت میں کبار اولیاء' اللہ' علماءِ دین' مصلحین اور مجاہدین پیدا کئے جن میں حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۰۱۔۱۲۴۶ھ) کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن اور تاباں ہے' تکیہ نام کی یہ چھوٹی سی بستی رائے بریلی شہر سے میل ڈیڑھ میل دور مغربی سمت میں ایک نہایت پر فضا ٹیلے پر واقع ہے۔ شہر سے تکیہ کی طرف جو سڑک جاتی ہے' اس کو سرکاری طور پر مولانا علی میاں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

تکیہ' "دائرہ شاہ علم اللہ" کے نام سے بھی مشہور ہے' کیونکہ سب سے پہلے اسے ۱۰۵۰ھ میں حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی نقشبندیؒ (۱۰۳۳۔۱۰۹۶ھ) نے بسایا تھا' اس بستی میں حسنی سادات کا مشہور خاندان ہی آباد ہے۔ تکیہ میں جو تاریخی اور بابرکت مسجد ہے' اس کی پختہ تعمیر ۱۰۸۳ھ میں حضرت شاہ علم اللہ صاحب کے مبارک ہاتھوں ہوئی تھی' بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیادوں میں زمزم ڈالا گیا اور اس کو بیت اللہ شریف کے نقشہ پر تقریباً اسی طول وعرض کے ساتھ بلا مینار و گنبد کے تعمیر کیا گیا' صرف ادباً چند انگل کم

رکھا گیا تھا' مسجد کے شمال کی طرف مغربی جانب تکیہ کے حسنی خاندان کا عام قبرستان ہے' جبکہ مسجد کے مشرق میں روضہ شاہ علم اللہؒ ہے' جس کی پندرہ قبروں میں ایک قبر مولاناؒ کی بھی ہے' جس کا اظہار پہلے کیا جاچکا ہے۔ مسجد کے جنوب کی طرف ایک ندی ہے' جس کا نام سئی ہے' بستی کے مکانوں کے مغربی جانب باغات اور مشرقی و شمالی جانب ہرے بھرے کھیتوں کا سلسلہ ہے' مولانا علی میاںؒ نے اپنی اس بستی اور یہاں واقع ندی کا تذکرہ اپنی بعض عربی اور اردو کتابوں میں نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے' سخت بارش اور سیلاب کے زمانہ میں سئی ندی کی طغیانی اور فتنہ سامانی کا حال بھی بیان فرمایا ہے۔

تکیہ کلاں میں مسجد کے سامنے حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام سے ایک مدرسہ "حفظ قرآن کریم" کے طلبہ کے لئے خاص ہے جس کی عمارت نہایت خوبصورت نظر آئی' مدرسہ کی عمارت کا وہ حصہ جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی جائے پیدائش ہے' ان کی یاد میں وہاں کتب خانہ قائم ہے۔ تکیہ میں ایک ادارہ "دارِ عرفات" کے نام سے ہے' جو علمی' تحقیقی' تصنیفی' دعوتی اور اشاعتی ہے۔ دار العلوم ندوۃ العماء کے اونچے درجات کے طلبہ یہاں اپنے تعلیمی سال کے آخر میں کچھ دنوں قیام کر کے حضرت مولانا علیؒ سے حکمت و دعوت سے متعلق بعض اہم کتابیں پڑھتے تھے' اور اپنے دورانِ قیام میں مولانا کی صحبت میں رہ کر اپنی علمی و عملی زندگی میں رہنمائی بھی حاصل کرتے تھے۔ تکیہ سے متصل میدان پورہ میں ایک اچھا اور بافیض مدرسہ "ضیاء العلوم" کے نام سے ہے' ہم لوگوں نے مغرب کی نماز مدرسہ کی ہی مسجد' میں ادا کی' اور بعد نماز اساتذہ کرام کی خواہش پر اس فکر و آگہی کی بستی میں راقم الحروف کو طالب علمانہ معروضات پیش کرنی پڑی' حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب (مفتی دار العلوم دیوبند) نے بھی خطاب فرمایا۔

اب ہم تکیہ سے لکھنو کے لئے روانہ ہورہے ہیں' یہ خیال آرہا ہے کہ کتنی چھوٹی ہے یہ بستی مگر کتنا اونچا ہے اس کا مقام' مولانا علی میاںؒ کے علم اور قلم نے تو خاص طور پر اس کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگادیا' کبھی ایک فرد سے ایک چھوٹی اور غیر معروف بستی کتنی بڑی اور مشہور بن جاتی ہے اور ایسا فرد اپنی بستی' اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے عزت و وقار کا نشان بن جاتا ہے' یہ بھی خیال آرہا ہے کہ مولانا علی میاں کو بارگاہِ الٰہی سے جو محبوبیت و مقبولیت عطا ہوئی کلیدِ کعبہ سے سرفراز کئے گئے وہ بے نظیر عالم باعمل بنے' دین کے داعی اور شریعت کے محافظ ہوئے' تصنیف و تالیف میں اونچی قدروں کو چھوا' قیادت و سیادت ان کے حصہ میں آئی' کیا اس میں ان کی والدہ محترمہ خیر النساء بہتر مرحومہ کی اس پاکیزہ آرزو اور معصوم تمنا کا دخل نہیں ہے' جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط میں اس وقت کیا تھا جبکہ ان کا "ننھا علی" اپنا سفر علمی طے کر رہا تھا' انھوں نے لکھا تھا:

"علی! اگر میرے سو اولادیں ہوتیں، تو سب کو میں یہی دینی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کر سو کی خوبیاں تم سے حاصل ہوں، اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام اور صاحبِ اولاد کہلاؤں"۔

دل نے یہ فیصلہ دیا کہ مولانا علی کو مولانا علی میاں بنانے میں ان چند جملوں نے بڑا کام کیا ہے، ماں نے اپنے بیٹے کے لئے مقبول گھڑی میں جو دعاء کی تھی، وہ رد نہیں کی گئی۔ بلاشبہ آج کی ماؤں کے لئے ان چند جملوں میں عبرت و موعظت کی ایک پوری دنیا آباد ہے۔

اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ جب تکیہ سے ہم رخصت ہونے لگے تو تکیہ نے بغیر تکیہ کے ابدی نیند سونے والے اپنے لائق فرزند (علی میاں) کا نہایت معنی خیز پیغام، ان کی گذری ہوئی زندگی کے پس منظر میں اقبال کے ذریعہ اہل علم و کمال کو یہ دیا کہ ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
نہیں یہ شانِ خود داری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہان رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے

میرے قیام کے دوران لکھنو میں مولانا علی میاں کے سلسلہ میں متعدد تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ ایک جلسہ کا اہتمام آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ نے بھی ۸/ فروری منگل کو بعد نماز مغرب دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں کیا تھا، ایک بہت بڑا جلسہ اہلِ لکھنو نے ۱۳/ فروری اتوار کو دن میں کیا تھا، جس کی صدارت مولانا کے جانشین حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء نے کی تھی، اس جلسہ کو ممتاز مسلم اور غیر مسلم قائدین نے مخاطب کیا، بیرونی مقررین میں راقم الحروف کے علاوہ پروفیسر انیس چشتی (پونہ) بھی تھے۔
اس طرح کے تمام جلسوں میں مقررین نے مولانا کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو مختلف انداز سے اجاگر کیا اور یہ تاثر دیا کہ مولانا کے فکر و فلسفہ، پیغام اور مشن کو باقی رکھنا، اسکو رواج دینا اور ان کی کتابوں سے روشنی حاصل کرنا ہی دراصل مولانا کی "حقیقی یاد" ہے۔ مولانا نے دار العلوم ندوۃ العلماء، مسلم پرسنل لابورڈ، مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، دینی تعلیمی کونسل، حلقہ پیام انسانیت اور رابطہ ادب اسلامی وغیرہ کے ذریعہ اپنے کام کا جو انداز اور بنیادی نقشہ چھوڑا ہے، وہ نہایت اہم ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی اہمیت کو

سمجھا جائے اور مولانا جن اداروں سے ذمہ دارانہ طور پر وابستہ رہے ہیں ان کو مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

۹/ فروری کی شام کو تکیہ پہنچ کر حضرت مولانا علی میاںؒ کی تربت پر حاضری دی تھی' اسی مناسبت سے مولانا مرحوم اور ان کی بستی کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا گیا' اسی دن صبح جامعہ سید احمد شہیدؒ کو بھی دیکھنے کا موقع ملا' جامعہ کی نسبت نام سے ظاہر ہے۔ یہ جامعہ اودھ کے مشہور قصبہ ملیح آباد سے چار کلو میٹر دور کٹولی میں ایک وسیع و عریض خطۂ آراضی پر قائم ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام سے اس علاقے کو ''احمد آباد'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس جامعہ کے تحت حضرت داؤد علیہ السلام کے نام پر الگ سے ایک خوبصورت عمارت میں فنی تعلیم کا بھی نظم ہے مختلف کلیات میں ''کلیۃ الحیوان'' اور ''کلیۃ الزراعۃ'' بھی ہے۔ جامعہ سید احمد شہیدؒ کے تعلیمی' تربیتی اور فنی نظام میں مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی جودت طبع اور حوصلہ مندی کام کر رہی ہے۔ جامعہ کی بتدریج اپنی شناخت بھی قائم ہو رہی ہے۔ مولانا صہیب حسینی ندوی اور مولانا کمال اختر ندوی نے جامعہ کا تفصیلی تعارف کرایا۔ جامعہ کے زیر اہتمام مولانا علی میاںؒ کی شخصیت اور کارناموں پر سہ روزہ سمینار (۲۸/ تا ۳۰ مارچ ۲۰۰۰ء) جامعہ کے احاطہ ہی میں منعقد ہونے والا ہے۔

لکھنو کے مضافاتی علاقہ میں ''جامعۃ المؤمنات الاسلامیہ'' کے نام سے لڑکیوں کی دینی و عصری تعلیم کا یک باوقار ادارہ ہے' عمارت بھی شاندار ہے' اس ادارہ کو مولانا محمد رضوان ندوی مرحوم نے قائم کیا تھا' مولانا اس ادارہ کے لئے بڑی محنت اور مستعدی سے کام کر رہے تھے مگر گذشتہ سال ایک سڑک کے حادثہ میں اپنے مولیٰ سے جا ملے' عمر ابھی زیادہ نہیں تھی' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ موت جس قدر یقینی ہے' اس کا وقت اسی قدر غیر یقینی ہے۔ اب اس ادارہ کی دیکھ بھال مولانا مرحوم کے بھائی مولوی محمد عرفان اور ان کے قریبی عزیز مولانا مطیع الحق انظر ندوی کر رہے ہیں' ندوہ کے ذمہ داران اور اساتذہ کی سرپرستی بھی اسے حاصل ہے۔ اس مدرسہ میں وقتی طور پر ایک جلسہ کا اہتمام کر لیا گیا تھا' جسے راقم الحروف کے علاوہ ڈاکٹر محسن عثمانی اور مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے مخاطب فرمایا۔

۱۰/ فروری کی صبح ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی (پیدائش ۱۹۳۱ء) سے ملاقات پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ان کی رہائش گاہ پر ہوئی' ڈاکٹر صاحب لکھنوی تہذیب کے مکمل نمائندہ ہیں شخصیت مقناطیسی ہے' گفتگو کا انداز متاثر کن ہے' دین و دانش کی حسین امتزاجی کیفیت کے حامل' اہل فکر و نظر میں شامل۔ نفاست' نظافت اور نزاکت' طبیعت میں اسی طرح رچی بسی' جیسے کہ پھول میں خوشبو۔ دینی ملی تعلیمی اور فلاحی کام میں ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں۔ مولانا علی میاںؒ کے رفیق کار کی حیثیت سے بھی انھیں کام کا موقع

ملتا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ علیگ ہیں' اپنے تعلیمی سلسلہ میں لندن بھی جا چکے ہیں' اس لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کاز سے ان کو بڑی ہمدردی ہے۔ ایک زمانہ میں انھوں نے مسلم مجلس مشاورت کے کام کو تقویت پہنچانے میں اہم رول ادا کیا' مسلم پرسنل لا بورڈ کے تاسیسی رکن ہیں' دینی تعلیمی کونسل کے تحت اتر پردیش میں جو اس وقت بیس ہزار دینی تعلیم کے ساتھ پرائمری اسکول چل رہے ہیں' اس کے بالغ نظر جنرل سکریٹری ہیں' کونسل کی صدارت کا عہدہ جلیلہ مولانا علی میاںؒ کی وفات سے ابھی خالی ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب جہاں اپنے پیشہ طب میں مہارت رکھتے ہیں اور بعض امراض کا نہایت کامیاب علاج کرتے ہیں' اس کے ساتھ ان کا قلم بھی نہایت پختہ ہے' ان کی قلمی پختگی کے نمونے ہر ہفتہ "ندائے ملت" پیش کرتا ہے' ملکی حالات پر گہری نظر ہے' سیاسی تبصرے اور تجزیے ایسے ہوتے ہیں کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" ڈاکٹر صاحب دینی تعلیمی کونسل کے علاوہ لڑکیوں کی دینی وعصری تعلیم کے لئے ایک مستقل تعلیمی ادارہ "مدرسہ نور الاسلام" کے نام سے چلا رہے ہیں' نہایت کشادہ آراضی پر وسیع اور خوبصورت عمارتوں کا دل آویز تسلسل ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی دلچسپی' عالی حوصلگی اور خوش انتظامی کی نمایاں علامت ہے۔ دیکھنے کے بعد محسوس ہوا کہ انتظامات بہتر ہیں' صفائی ستھرائی کا بھی اہتمام ہے' ایک اچھی بات اس ادارہ کی یہ بھی ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مرد کی بجائے باصلاحیت اور بااستعداد خواتین معلمات ہیں۔

مدرسہ نور الاسلام (برائے تعلیم نسواں) کے بعد تھوڑی دیر کے لئے دینی تعلیمی کونسل کے دفتر بھی گیا' ذمہ داران اور کارکنان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ محسوس یہ ہوا کہ کام منظم طریقہ پر سلیقہ وشعور کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ یہ حضرات چاہتے ہیں کہ آندھرا پردیش میں بھی دینی تعلیمی کونسل کے نہج پر کام کیا جائے' اور اس کے نظام سے یہاں بھی فائدہ اٹھایا جائے ان کی اس بہتر خواہش کا بہتر نتیجہ نکلنا چاہیئے۔

اس سفر میں مجھے دار العلوم ندوۃ العلماء میں زیادہ سے زیادہ رہنے کا موقع ملا' مولانا محمد رابع حسنی ندوی (ناظم)' مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی (معتمد تعلیم) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم) اور مولانا شمس الحق ندوی (مدیر تعمیر حیات) کی عنایات سے بہرہ ور ہوتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ندوہ ان دنوں شہرت کے بام عروج پر ہے' وہ اپنے بانی (مولانا سید محمد علی مونگیریؒ) کے اخلاص کی داستان سنا رہا ہے' تعلیمی بہار ہے' نظام کا استحکام ہے' فضا میں علم کی خوشبو ہے' تربیت کے نقوش ہیں' پر شکوہ عمارتیں ہیں' کم وبیش تین ہزار طلبہ استفادہ کر رہے ہیں' دسویں تعلیمی اور تحقیقی شعبے قائم ہیں' گویا وہ مکمل "اسلامی یونیورسٹی" ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک عام مدرسہ سے اسے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے' داخلی

وخارجی حیثیت سے مضبوط و مستحکم کرنے اور بین الاقوامی سطح پر شہرت وعظمت دلانے میں مولانا علی میاں کے دورِ نظامت کا دخل ہے' اور یہ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے' ندوہ کو دیکھ کر دل سے بار بار یہ دعا نکلتی رہی ۔

شمع جلتی رہے' ہوتا رہے محفل کو فروغ

دس روزہ سفر کے دوران کتابوں کی شکل میں جو "علمی تحفے" ملے' وہ نہایت قیمتی ہیں' مضمون میں گنجائش نہیں کہ ایک ایک کا نام لکھ کر تبصرہ کیا جائے۔ بس تحفہ دینے والے حضرات سے شکریہ پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے' اس سفر میں لکھنو اور اس کے اطراف کی شعری اور ادبی شخصیتوں کی یاد آتی رہی' میرا یہ سفر الحاج بہاء الدین صاحب (پیدائش ۱۹۲۴ء) کی بزرگانہ رفاقت میں نہایت خوش گوار رہا' ان کا ادبی اور شعری ذوق بہار دکھاتا رہا' طبیعت کی شگفتگی بھی سامنے آتی رہی۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے خصوصی تعلق کی بنیاد پر ان کا تذکرہ' لذت اور حلاوت کے ساتھ کرتے رہے' ان دونوں بزرگوں سے متعلق دل چسپ اور علم افزا واقعات بھی سناتے رہے جب میں ۱۴/ فروری کو حیدر آباد واپس ہونے کے لئے لکھنو اسٹیشن آیا تو آتش لکھنوی نے یہ کہتے ہوئے رخصت کیا ۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار' راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے' دشمن ہزار راہ میں ہے

خبرنامہ
دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

مولانا عبدالمجید قاسمی

○ تعطیلاتِ کلاں (رمضان) کے بعد نئے سال کے لئے ۱۱رشوال ۱۴۲۰ھ کو حسب معمول جدید و قدیم داخلوں کا آغاز ہوا، اس سال مجموعی حیثیت سے (۵۷۰) طلبہ کے داخلے منظور کئے گئے، شعبۂ روضۃ الاطفال، شعبۂ تحفیظ القرآن اور شعبۂ عالمیت وفضیلت کے علاوہ شعبۂ تخصصات (کلیۃ الشریعۃ، کلیۃ اللغۃ، کلیۃ الدعوۃ) میں ہندوستان کی مختلف دینی درس گاہوں) کے (۵۲) فضلاء کو داخلہ دیا گیا۔

○ مورخہ ۱۵رجنوری کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحؒ کے سانحۂ ارتحال پر حیدرآباد میں جامعۂ ہٰذا نے ایک مرکزی تعزیتی جلسۂ عام کا اہتمام کیا، مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالکریم پاریکھ، خازن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے صدارت کی، اس جلسہ کو معروف صحافی و دانش ور اور حضرت مولانا علی میاںؒ کے قدیم رفیق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھنؤ، شہر حیدرآباد کی ممتاز علمی شخصیتوں اور دینی مدارس کے ذمہ داروں نے مخاطب کیا، حضرت ناظم صاحب مدظلہ نے جامعہ کی طرف سے ایک تعزیتی قرارداد پیش فرمائی، جو شہر کے تمام اردو اخبارات میں شائع ہوئی۔

○ مورخہ ۲۲رشوال ۱۴۲۰ھ، مطابق ۳۰رجنوری ۲۰۰۰ء کو جامعہ ہٰذا میں جلسۂ افتتاح درس بخاری شریف کا انعقاد عمل میں آیا، محدثِ جلیل حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری (شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند) نے خطاب فرمایا۔

○ مورخہ ۲۹رجنوری ۲۰۰۰ء کو نہرو آڈیٹوریم مدینہ ایجوکیشن سنٹر باغ عامہ میں جامعہ ہٰذا کے زیر اہتمام ایک اجتماعِ عام منعقد ہوا۔ اس اجتماع کا عنوان "تحریکِ آزادیِ ہند میں مسلمان اور علماءِ اسلام کا کردار" تھا، حضرت ناظم صاحب مدظلہ کے زیرِ صدارت اس اجتماع سے حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیری (شیخ الحدیث دارالعلوم وقف، دیوبند) نے

خطاب فرمایا

○ مورخہ ۸ رفروری ۲۰۰۰ء کو مجلسِ عاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں شرکت کے لئے حضرت ناظم صاحب مدظلہٗ نے لکھنؤ کا سفر فرمایا، اسی سفر میں اسلامک فقہ فقہ اکیڈمی ہند کے زیر اہتمام دار العلوم اسلامیہ بستی (یوپی) میں منعقدہ بارہویں فقہی سمینار (منعقدہ ۱۱ رتا ۱۴ رفروری ۲۰۰۰ء) میں بھی حضرت ناظم صاحب مدظلہٗ نے شرکت فرمائی۔ ان دونوں اجتماعات میں شرکت اور سفر سے واپسی کے بعد حضرت ناظم صاحب نے ایک مفصل رودادِ سفر "دیارِ لکھنؤ میں چند دن" کے عنوان سے تحریر فرمائی، جو دو قسطوں میں روزنامہ سیاست، حیدر آباد میں شائع ہوئی۔

○ اسلامک سنٹر سیاٹل واشنگٹن کی دعوت پر مولانا احمد عبد المجیب صاحب قاسمی، ندوی (استاذ جامعہ ہٰذا) رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ میں امریکہ تشریف لے گئے، کم وبیش تین ماہ طویل دینی ودعوتی سفر میں انہوں نے امریکہ وکنیڈا کے متعدد شہروں کا سفر کیا اور مختلف دینی اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ سفر سے واپسی کے بعد مورخہ ۲۰ رمارچ ۲۰۰۰ء کو جامعہ ہٰذا کے سیمینار ہال میں تاثراتِ سفر امریکہ بیان کئے، اس اجتماع سے ممتاز عالم دین مولانا میر الیاس علی صاحب قاسمی (مقیم امریکہ) کے علاوہ حضرت ناظم صاحب مدظلہٗ اور جناب مولانا محمد برکت اللہ صاحب قاسمی استاذِ حدیث جامعہ ہٰذا نے خطاب فرمایا۔

SAFA

صفا

جامعہ کے احاطہ میں تعمیر شدہ وسیع مسجد "جامع عمر بن الخطابؓ"



شائع کردہ: شعبہ نشر و اشاعت دار العلوم سبیل السلام مدینۃ العلم حیدرآباد

JAMIA ISLAMIA
DARUL ULOOM SABEELUSSALAM
Sabeel Nagar (Behind Salala, Barkas)
Hyderabad - 500 005 (A.P.), India.